سلسلہ تبلیغ ۲۳

بار اول ۳۰۰۰

الانسداد للفساد

(فساد دُور کرنے کا طریقہ)

از افادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ

حاشیہ

مولانا خلیل احمد تھانوی، محمد عبدالقوی سروہی

شعبہ نشر و اشاعت

جامعہ دار العلوم الاسلامیہ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ — اکتوبر ۱۹۹۳ء

فون پرانی انار کلی ۲۵۳۷۲۸ — کامران بلاک ۴۴۸۰۶۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولٰنا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وعلٰی اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد فقد قال النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ایاکم وفساد ذات البین فانھا ھی الحالقۃ لا اقول تحلق الشعر ولکن تحلق الدین[1]

تمہید یہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک موقعہ پر اس کے بیان کا ارادہ تھا اور یہاں کے لیے کوئی دوسرا مضمون بیان کرنے کا قصد[2] تھا، مگر وہاں بیان کا اتفاق نہ ہوا اس لیے اس وقت اسی حدیث کو اختیار کر لیا ہے تاکہ دوسرا مضمون اور دوسری حدیث تلاش نہ کرنا پڑے اور پہلے موقعہ کے لیے اس کے اختیار کی اصل وجہ یہ

---

[1] :- نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ باہمی فساد سے بچو کیونکہ باہمی فساد مونڈنے والی چیز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے سر کے بال مونڈ جاتے ہیں، بلکہ اس سے دین مونڈ جاتا ہے۔ (او کما قال)

[2] :- ارادہ۔

تھی کہ حق تعالیٰ نے یہ مضمون دل میں ڈالا تھا کیونکہ آج کل اس کی سخت ضرورت ہے یوں تو ہر مرض کے متعلق علاج کی ضرورت ہے، مگر جس خاص مرض کی وبا[1] کے زمانہ میں کثرت ہوتی ہے اس کے علاج و دوا کا خاص اہتمام ہوتا ہے، اگر وبا کا زمانہ ہو تو پھر کسی مرض کے علاج کے لیے کوئی خاص مرجح[2] نہیں ہوتا۔ بلکہ جتنے امراض لوگوں میں موجود ہوں ان میں سے ہر مرض یہ چاہتا ہے کہ میرا علاج بھی کیا جائے اور علاج کا طریقہ بیان کیا جاوے۔ لیکن جب کسی خاص مرض کا شیوع[3] ہو تو اب اس کے بیان کے لیے کسی مرجح کی ضرورت نہیں، اس کا شیوع خود مرجح ہے۔ پس جس طرح امراض جسمانی میں شیوع و عدم شیوع سے تفاوت ہوتا ہے، اسی طرح امراض نفسانی میں بھی کثرت مرجح ہو جاتی ہے۔ جس مضمون کو میں نے اس وقت اختیار کیا ہے اس کے لیے یہی امر مرجح کافی ہے کہ اس میں جس مرض کے مفاسد پر متنبہ کیا گیا ہے آجکل اس کی بہت کثرت ہے اور آجکل سے مراد صرف یہی زمانہ حاضرہ نہیں بلکہ قریب دو تین سال سے اس کا شیوع ہو رہا ہے۔

ابتداءِ نزاع

اور اصل بنیاد تو اس کی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعہ قتل سے پڑی ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب میری امت میں تلوار نیام سے باہر ہو جائے گی تو پھر قیامت تک نیام میں نہ ہوگی، علماء سلف نے تصریح کی ہے کہ اس کی ابتداء حضرت عثمانؓ کے واقعہ سے ہوئی ہے۔ یہ پہلا واقعہ ہے کہ جس میں مسلمانوں کے اندر اختلاف و نزاع پیدا ہوا، اس کے بعد پھر اختلاف بڑھتا ہی گیا، کبھی کبھی انیس بیس کا تو فرق ہوا مگر استیصال[4] کبھی نہیں ہوا۔ تو یہ مرض اسلیئے بھی اشد[5] ہے کہ بہت پرانا ہے اور ظاہر ہے کہ پرانا بخار دق بن کر ہلاکت تک نوبت پہنچا دیتا ہے۔ نیز یہ اس واسطے بھی سخت ہے کہ ایک حدیث میں آیا

۱۔ طاعون۔ ۲۔ ترجیح دینے والا۔ ۳۔ عموم۔ ۴۔ جڑ سے ختم۔
۵۔ سخت۔

ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمّت کے لیے تین دعائیں کی تھیں، ایک یہ کہ میری اُمّت قحط عام سے ہلاک نہ ہو، دُوسرے یہ کہ مخالفین کا ان پر غلبۂ عام نہ ہو جس سے مسلمانوں کا استیصال ہو جائے، تیسرے یہ کہ مسلمان آپس میں نہ لڑیں۔ پہلی دو نوں دعائیں قبول ہوئیں، اور بحمد اللہ آج تک برابر ان دونوں بلاؤں سے یہ اُمّت محفوظ ہے۔ نہ اس پر قحط عام ہوتا ہے نہ مخالفین کا عام غلبہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی خاص مقام پر مسلمان مغلوب ہوں لیکن کسی دُوسرے مقام پر مسلمانوں کا غلبہ بھی ہوتا ہے اور غلبہ نہ بھی ہو تو استیصال[1] تو مسلمانوں کا قیامت تک نہ ہو سکے گا بلکہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں مسلمان مغلوب بھی ہیں وہاں بھی اسلام کو روز بروز[2] ترقی ہے، بہت سے کافر آئے دن اسلام میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دعا کی برکت ہے، تاکہ مسلمانوں کا استیصال نہ ہو جائے۔ مگر تیسری بات کے متعلق حدیث میں آیا ہے فمنعنیہا۔ یعنی یہ دُعا قبول نہیں ہوئی، اس لیے یہ مرض اور بھی سخت ہے کیونکہ اس کے متعلق دُعا قبول نہ ہونے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ مرض مسلمانوں میں باقی رہے گا، اس کا استیصال نہ ہو گا۔ پس اس کے علاج کی طرف ہر وقت توجہ کی ضرورت ہے کیونکہ مادہ تو موجود ہی ہے، ذرا سی غفلت میں

---

[1] :۔ جڑ سے ختم ہونا۔

[2] :۔ بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جس قوم نے مسلمانوں کے استیصال کا قصد کیا حق تعالیٰ نے اسی کو اسلام کا خادم اور حامی بنا دیا۔ چنگیز خاں نے اس کا ارادہ کیا تھا اور خلافت بغداد کو تاراج کیا تھا، حق تعالیٰ نے اسی کی اولاد کو اسلام کا حلقہ بگوش کر دیا۔ اس سے پہلے فارسیوں نے اس کا ارادہ کیا تھا وہ بھی سب مسلمان ہو گئے، ہرقل نے گو مقابلہ تو مسلمانوں کا کیا مگر استیصال کا ارادہ نہ کیا تھا۔ بلکہ ہر موقع پر اپنی قوم کو اسلام کی ترغیب دلاتا رہا۔ اسلیئے اس کا کچھ بقیہ موجود ہے پس ہم کو کسی کے اس ارادہ سے رنج نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے اسلام لانے کی اُمید قوی ہو جاتی ہے۔ ۱۲ ظ۔

اس کے بڑھ جانے کا خطرہ ہے[1]

نااِتفاقی کی پیشین گوئی

شاید کوئی کہے کہ جب حدیث میں پیشین گوئی آچکی ہے کہ یہ باہمی نااتفاقی کا مرض زائل نہ ہوگا تو پھر علاج کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی پیشین گوئی کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ طبیب کو کسی مریض کی بابت معلوم ہو جائے کہ یہ پرہیز نہ کرے گا، اس لیے پیشین گوئی کر دے کہ یہ بیمار اچھا نہ ہوگا، مگر اس کی بد پرہیزی کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ اچھا نہ ہوگا۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ مرض خود لاعلاج ہو جیسے دِق جو درجۂ چہارم میں پہنچ جائے۔ سو یہاں پیشین گوئی دُوسری صورت کی نہیں بلکہ پہلی صورت کی ہے۔ تو اس سے مرض کا لاعلاج ہونا اور علاج کا غیر نافع[2] یا غیر ضروری ہونا لازم نہیں آتا، اور وجہ اس پیشین گوئی کی دُوسری نہ ہونے کی یہ ہے کہ یہ تقسیم امراضِ جسمانی ہی کے ساتھ خاص ہے کہ ان میں بعضے خود لاعلاج ہوتے ہیں اور بعضے بد پرہیزی سے خطرناک ہو جاتے ہیں امراضِ نفسانی میں یہ تقسیم ہی نہیں ہے، بلکہ یہاں سب امراض قابلِ علاج ہیں لاعلاج کوئی نہیں، بلکہ ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امراضِ جسمانیہ بھی فی نفسہٖ[3] لاعلاج کوئی نہیں۔

ابوداؤد ترمذی کی حدیث میں ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَمْ یَضَعْ دَآءً اِلَّا وَضَعَ لَہٗ دَوَآءً غَیْرَ دَآءٍ وَّاحِدٍ وَّھُوَ الْھَرَمُ۔ خدا تعالےٰ نے کسی مرض کو پیدا نہیں کیا مگر اس کے لیے دوا بھی پیدا کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مرض جسمانی بھی قابلِ علاج ہے۔ باقی جو ظاہراً اُس پر اشکال ہوتا ہے کہ پھر بعضے مریض مایوس العلاج کیوں ہوتے ہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مرض کے ہمارے لاعلاج ہونے سے اس کا فی نفسہٖ[3] لاعلاج ہونا لازم نہیں۔ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس

---

[1] : یہ مضمون بہت عجیب ہے اہلِ علم غور سے دیکھیں۔ ۱۲ ظ۔

[2] :۔ فائدہ نہ دینے والا۔ [3] :۔ اپنی ذات میں۔

کی دوا پیدا کی ہو مگر ہمارے علم میں نہ آئی ہو۔ پس ممکن ہے کہ دق کے لیے بھی علم الٰہی میں اور واقع میں کوئی دوا ہو جو ہم کو نہیں معلوم ہوئی اس لیے ہم اس کو لاعلاج کہنے لگے۔

سو اس تقریر سے تو امراض جسمانی میں بھی وہ تقسیم منتفی ٹھہرتی ہے، لیکن اگر تقسیم کو صحیح ہی فرض کر لیا جاوے اور حدیث کو اکثر پر محمول کیا جاوے تب بھی امراض روحانی میں وہ تقسیم نہیں ہے۔ بلکہ یہ قسم کہا جاتا ہے کہ ان میں ہر مرض کی دوا واقع میں بھی ہے اور ہم کو بتلائی بھی گئی ہے۔ یہاں کوئی مرض ایسا نہیں جس کی دوا بتلائی نہ گئی ہو۔ سارا مطلب مکمل ہے اور مکمل کر کے ہی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ [1] نازل ہوا ہے۔ اگر کسی کا روحانی مرض لاعلاج ہوتا اور کوئی مریض روحانی مایوس العلاج ہوتا تو سب سے زیادہ مستحق اس کے وہ لوگ تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ [2] نازل ہوا ہے، مگر ان کا کفر بھی فی نفسہٖ لاعلاج نہ تھا۔ بلکہ ان کی بد پرہیزی کی وجہ سے یہ پیشین گوئی کی گئی ہے۔

خاتمہ کا حال

بعض مفسرین کا قول تو یہ ہے کہ یہ آیت خاص خاص لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی ہے، جن کا نام حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا گیا تھا۔ اور بعض کا قول یہ ہے کہ بلا تعیین یہ ان سب لوگوں کے بارے میں جن کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے۔ اور خاتمہ سے پہلے کسی کو بھی حتیٰ کہ ابوجہل کو بھی علی الاطلاق کافر نہیں کہہ سکتے تھے۔ کیونکہ شاید اخیر میں اسلام لے آتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید — کہ مسلمان بودنش باشد امید [3]

---

[1] :۔ المائدہ آیت ۳ آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا۔ (بیان القرآن)۔ [2] :۔ البقرہ آیت ۷، بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں پر۔ (احکام القرآن)۔ [3] :۔ کسی کافر کو ذلت کی نظر سے نہ دیکھو کیونکہ اس کے مسلمان ہونے کی امید ہوتی ہے۔

مگر اس وقت وحی کا زمانہ تھا۔ اس وقت خاتمہ کا حال معلوم ہو سکتا تھا کہ کس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے۔ اس لیے جن کفّار کی نسبت صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے ان کے نام صحابہ نے اس آیت کی تفسیر میں تمثیلاً[1] بیان کر دیئے۔ اور مطلب یہ تھا کہ یہ آیت ان جیسے لوگوں کے بارہ میں ہے جن کا خاتمہ کفر پر ہو گا سب کافروں کے بارہ میں نہیں ہے۔

مگر اب تو خاتمہ کا حال معلوم ہونا دشوار ہے۔ اگر ظاہر میں کسی کا کفر ہی پر خاتمہ ہو جب بھی یقینی طور پر کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہم کو دل کا حال کیا معلوم ہے شاید وہ دل میں مسلمان ہو اور زبان سے اقرار کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو یا ملا ہو۔ اور اس نے تساہل[2] کیا ہو تو بہت سے بہت گنہگار ہو گا مگر کافر نہ ہو گا۔ بلکہ عنداللہ[3] ایسا شخص مسلمان ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان مرتے ہوئے کلمۂ کفر کہتا ہوا جائے جب بھی کفر کا حکم مشکل ہے۔ فقہا نے اس کا راز سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مرتے ہوئے کسی کے منہ سے کلمۂ کفر نکل جائے تو اس کو کافر نہ کہو کیونکہ ممکن ہے شاید نزع کی وجہ سے اس کی عقل درست نہ ہو اور بے ہوشی کی غفلت میں یہ کلمہ زبان سے نکلا ہو اور شریعت میں ایسا شخص مکلف[4] نہیں رہتا بے ہوشی میں جو فعل و قول بھی صادر ہو شرعاً معاف ہے یا ممکن ہے کوئی ہوش ہی میں کلمۂ کفر کہہ رہا ہو، مگر اس کا مطلب وہ نہ ہو جو تم سمجھے، بلکہ کچھ اور مطلب ہو۔ پھر اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے حکم کفر کیونکر لگایا جا سکتا ہے۔

احوال و مقامات

اس پر مجھے ایک بزرگ کا واقعہ یاد آیا کہ جب وہ مرنے لگے، نزع کی حالت ہوئی تو لوگ ان کو کلمہ کی تلقین کرتے تھے اور وہ اس سے اعراض[5] کرتے اور منہ پھیر پھیر لیتے۔ لوگوں نے ان

---

[1]: مثال کے طور پر۔ [2]: سستی۔ [3]: اللہ کے نزدیک۔
[4]: پابند۔ [5]: گریز۔

کے پیر بھائی کو جو بجائے شیخ کے تھے، اس حال سے اطلاع کی کیونکہ اس اعراض سے سب پریشان ہو گئے تھے۔ عوام کے نزدیک تو بس وہ نعوذ باللہ[1] کافر ہو چکے تھے۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور ان کو آواز دی تو فوراً آنکھیں کھول دیں اور تبسم فرمایا۔ اس سے پہلے وہ کسی سے بات بھی نہ کرتے تھے کیوں؟ اس لیے کہ ؎

ہر کہ او از ہم زبانے شد جدا ۔۔۔ بے نوا شد گرچہ دارد صد نوا[2]

وہ ان کے ہم زبان نہ تھے۔ اب ہم زبان آ گئے تو آنکھیں کھول دیں اور باتیں کرنے لگے۔ دوسری وجہ حافظ شیرازیؒ بیان فرماتے ہیں ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی ۔۔۔ بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی[3]

وہ اپنی حالت کسی اور سے اس لیے نہ کہتے تھے کہ اس کا سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ اور ایسے لوگوں کے سامنے اسرار کا بیان کرنا حرام ہے مولانا فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند ۔۔۔ از سخنہا عالمے را سوختند[4]

یہ وہی لوگ ہیں جو نااہلوں کے سامنے اسرار[5] کو بیان کرتے ہیں۔ ان بزرگ نے اسی لیے نا اہلوں کے سامنے اپنی حالت بیان نہیں کی۔ جب اہل آ گیا تب کھلے اور کہا کہ حضرت ان لوگوں کو منع کر دیجیے کہ مجھے تنگ نہ کریں۔ فرمایا یہ تو کلمہ کی تلقین کرتے ہیں۔ کہا یہ مجھ کو مسمّٰی[6] سے اسم کی طرف لاتے ہیں۔ خود محبوب کے سامنے ہوتے ہوئے نام کی کیا ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں تو اب میرا نام لینے کی آپ کو کیا ضرورت ہے۔ مگر یہ ایک حال ہے اور صاحبِ مقام اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ؟ اس طرح کہ وہ مشاہدہ مسمّٰی کے ساتھ اسم

---

[1]: اللہ کی پناہ۔ [2]: ہر وہ شخص کہ جو اپنے ہم زبان سے جدا ہو گیا ہو۔ بے آواز ہے اگرچہ سو آوازیں رکھتا ہو۔ [3]: جو مدعی ہو اس سے عشق کے اسرار مت بیان کرو اس کو اپنے حال پر چھوڑ دو تاکہ اپنی خود پسندی کے رنج میں مر جائے۔ [4]: ظالم ہیں وہ لوگ جنہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور اسرار کو نا اہلوں کے سامنے بیان کر کے عالم کو جلا دیا۔ [5]: پوشیدہ راز [6]: مشاہدہ ذات (یعنی اللہ تعالیٰ)

کو بھی جمع کرتا ہے، کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ محبوب کو یہی پسند ہے کہ دیکھتے بھی جاؤ اور ہمارا نام بھی لیتے رہو، اس لیے وہ دونوں کو جمع کرتا ہے دوسرا راز اتفاقاً البونواس شاعر کے منہ سے نکل گیا کہتا ہے ؎

اَلَا فَاسْقِنِیْ خمرًا وقل لی ھی الخمر   وَلَا تَسْقِنِیْ سِرًّا متی امکن الجہر[1]

یعنی مجھ کو شراب پلاتا جا اور یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے، یہ شراب ہے، آخر پیتے ہوئے اس کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کو عاشق ہی سمجھ سکتا ہے، اس کہنے کی یہ ضرورت تھی تاکہ نام سن کر کانوں کے ذریعہ سے لذت حاصل ہو اور دیکھ کر آنکھ کے ذریعہ سے لذت حاصل ہو اور پی کر زبان کے واسطے سے لذت حاصل ہو۔ الغرض تمام جسم اس کی لذت سے بھرا ہوا ہو، یہی غرض صاحب مقام کی ہوتی ہے، مسمّٰی کے ساتھ اسم کو جمع کرنے سے، تاکہ قلب کے ساتھ زبان اور کان بھی لذتِ ذکر میں سرشار ہوں، سِر بُن[2] مُو سے اس کی یاد ہو۔ مگر صاحبِ حال مشاہدہ کے وقت اسم کو جمع نہیں کر سکتا۔ اس کی زبان ہی اس وقت نہیں اٹھتی، تو وہ بزرگ اس حال میں تھے جو شیخ کو معلوم ہوا۔ بھلا عوام کیا سمجھتے، اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ صاحبِ مقام نہ تھے، ممکن ہے وہ صاحبِ مقام بھی ہوں لیکن اہلِ مقام پر بھی حال کا غلبہ ہو سکتا ہے۔ گو کم ہوتا ہے۔ لیکن اس کم کا کوئی وقت مقرر نہیں ممکن ہے ان بزرگ پر وقت موت ہی کے غلبہ ہوا ہو۔

بہر حال اگر شیخ نہ آتے تو لوگ یوں کہتے کہ فلاں کافر بے ایمان ہو کر مرا، مگر شیخ نے حقیقتِ حال معلوم کر کے سب کو فرمایا کہ یہ تو اس وقت بڑے درجہ پر ہیں، مشاہدہ ذات حق میں مشغول ہیں، ان کو مت چھیڑو۔ اب لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہوا کہ ؎

---

[1]: اور خاموشی کے ساتھ نہ پلاؤ جب تک ظاہر کر کے پلانا ممکن ہے۔

[2]: بال کا سرا۔

در بنیابد حال پختہ ہیچ خام   پس سخن کوتاہ باید والسلام[1]

غرض اس وقت تو کسی کے کفر پر تیقن[2] نہیں ہو سکتا، مگر جس زمانہ میں اَلَّذِیْنَ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کا مشاہدہ ہو سکتا تھا اُس وقت بھی یہ لوگ مایوس العلاج اور ان کا کفر لاعلاج نہ تھا۔ بلکہ ان لوگوں کے اختیار میں تھا۔ اس طرح سے کہ ایمان لے آتے گو اس کا عدم وقوع[3] حق تعالیٰ کو معلوم تھا مگر عدم وقوع کے یقینی ہونے سے اس کا اختیاری ہونا منتفی نہیں ہوا۔ اور میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا بھی ہے تو مریض کو مجبور نہیں کرتا۔ بلکہ بعض تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ مریض بچے گا نہیں اس کو دوامت دو۔ اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبراً دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں وہ اپنے قواعد طبیہ سے اس مرض کو لاعلاج سمجھتا ہے مگر یہ سمجھنا ظنی ہے قطعی نہیں۔ وہ قدرتِ خدا تعالےٰ پر نظر کر کے امیدوار ہے ؂

عقل در اسباب میدارد نظر   عشق میگوید مسبب رانگر[4]

مگر حق تعالیٰ کو تو علم غیب ہے اگر خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ سے ان لوگوں کے لاعلاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی تو یہ دلالت قطعی ہوتی۔ کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے متعلق علم ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا[5]۔ کے

---

[1]: نہیں پاسکتا پختہ کے حال کو کچا پس بات تھوڑی کرو والسلام۔ [2] یقین۔ [3]: واقع نہ ہونا۔

[4]: عقل کی نظر اسباب پر ہوتی ہے۔ جبکہ عشق کہتا ہے مسبب الاسباب پر نظر رکھو۔

[5]: اللہ تعالیٰ کسی کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو۔ البقرہ آیت ۲۸۶۔

غلاف ہے تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے۔ کیونکہ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ[1] میں خطاب عام ہے اور یہ آیت مکی ہے پھر لفظ یٰاَیُّهَا النَّاسُ خود عموم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو توحید و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے، جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ[2] فرمایا گیا ہے۔ پھر اس پر اجماع بھی ہے کہ ابوجہل و ابوطالب وغیرہ ایمان کے مکلف تھے اگر وہ ایمان کے مکلف نہ ہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے، تو اخیر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے، آپ نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ نازل فرما دیا تھا۔ حالانکہ ان کا معذب[4] ہونا منصوص[5] ہے کیونکہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کے ساتھ ہی وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ[3] بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلف وہ بھی تھے اس سے مستثنیٰ نہ تھے اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ نازل ہوا ہے ان کا مرض روحانی لاعلاج نہ تھا اگر روحانی مطب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے۔ مگر وہ مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لاعلاج نہیں۔

---

[1]:۔ آیت ۲۱۔ البقرہ اے لوگو عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی۔
[2]:۔ البقرہ آیت ۷۔ بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر۔ (بیان القرآن)
[3]:۔ البقرہ آیت ۷ اور انکے لیے سزا بڑی ہے۔ (بیان القرآن)
[4]:۔ عذاب دیا ہوا ہونا۔
[5]:۔ قرآن کریم یا حدیث سے ثابت شدہ۔

تدابیر اتفاق کی ذمہ داری

رہا یہ سوال کہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی۔ جواب یہ ہے کہ یہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ نے حضورؐ کو بتلا دیا، مگر اس کا بھی مطلب یہ ہے لَا یُؤْمِنُ اَبُوْجَهْلٍ وَنَحْوُهٗ مَعَ بَقَاءِ اِخْتِیَارِهٖ [1] کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا ان کے اختیار سے ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ ان کو ایمان پر قدرت و اختیار ہی باقی نہیں رہا۔ خوب سمجھ لو۔ اس سے زیادہ کلام کرنا خوض فی القدر [2] جس کی اجازت نہیں غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصوص میں کسی امر کی پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا اور جب وہ اختیار سے خارج نہیں تو اس کی تدابیر کرنا فضول نہیں ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو، تو چاہیئے کہ آج سے حفظِ قرآن کو ترک کر دیا جائے ــــ کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ [3] جس میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے تو پھر نعوذ باللہ قرآن کا پڑھنا بھی چھوڑ دو، لکھنا بھی چھوڑ دو، چھاپنا بھی چھوڑ دو اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں ان کو دفن کر دو اور کہہ دو کہ بس قرآن کا حافظ اللہ ہی کافی ہے، ایک ہی حافظ بہت ہے اور وہ حافظ بھی کیسا جو محافظ بھی ہے۔ جتنے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی کر لیں گے، کیونکہ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں سب طریقے آ گئے۔ مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہو چکی ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ یہاں تو آپ نے یہ تجویز کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی، چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر

---

[1] :۔ ابوجہل اور اس جیسے دوسرے ایمان نہیں لائینگے باوجود اپنے اختیار کے ہوتے ہوئے

[2] :۔ مسئلہ تقدیر میں غور و خوض کرنا۔ [3] :۔ الحجر آیت ۹ ـ ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم اسکے محافظ (اور نگہبان) ہیں (بیان القرآن) ۱۲ خ۔

فرض بھی سمجھا اور نا اتفاقی کے متعلق پیشین گوئی وارد ہونے سے آپ نے یہ تجویز کر لیا کہ جب پیشین گوئی ہو چکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب حفاظت قرآن کا وعدہ ہو چکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے؟ آپ پر بھی وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں، اس کا جواب دیجئے۔ آخر دونوں میں مابہ الفرق کیا ہے فرق کا مبنیٰ[1] بتلایئے۔ اگر آپ نہیں بتلاتے تو لیجئے میں بتلاتا ہوں۔ آپ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سعی کریں گے اور ہم حفاظت کے طریقے ان کے قلوب میں ڈال دیں گے کہ وہ اس کو یاد بھی کریں گے، لکھیں گے بھی، پڑھیں پڑھائیں گے بھی۔ گویا اس طرح ہم ہی قرآن کے محافظ ہیں تو میں کہتا ہوں کہ یہ مبنیٰ دونوں جگہ مشترک ہے یعنی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد آپ کی حفاظت کو بھی اس میں دخل ہے، اسی طرح نا اتفاقی کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی بد پرہیزی کو اس میں دخل ہے اور اس پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چونکہ یہ لوگ باختیار خود بد پرہیزی کریں گے۔ اس لیے نا اتفاقی رہے گی۔ پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ خدا اور رسول کا کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کرنا اسکو مستلزم[2] نہیں کہ وہ دائرہ تکلیف سے باہر ہو جائے اور اس کی تدبیر نہ کی جاوے اور اس کا راز وہی ہے جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ پیشین گوئی کبھی مرض کے لاعلاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مریض کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لاعلاج کوئی مرض نہیں۔ یہاں جو پیشین گوئی بھی ہوتی ہے، مریض کے بد پرہیز ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

پس اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ نا اتفاقی کا دور کرنا آپ کی قدرت

---

[1] :۔ بنیاد۔ [2] :۔ لازم نہیں۔

سے باہر ہے تو اس لیے اس کی تدبیر بھی نہ کرنا چاہیئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگ اس سے باختیار خود پرہیز نہ کریں گے، اس لیے یہ مرض باقی رہے گا۔ لیکن اگر علاج کریں تو علاج کے مفید ہونے کی یہاں نفی نہیں۔ شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ اگر سب نے اس مرض کا علاج کرکے اتفاق کر لیا تو حدیث کی پیشین گوئی غلط ہو جاتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ مگر واقع میں سب ایسا کریں گے نہیں بلکہ تھوڑے بہت ضرور ایسے رہیں گے، جو نااتفاقی کرتے رہیں گے مگر ان میں تم ہی کو داخل ہونے کی کیا ضرورت ہے اور اس کی کیا دلیل ہے کہ تم ہی اس کے مصداق ہو۔

اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ میں اس پیشین گوئی کے سچا کرنے کے لیے نااتفاقی کرتا ہوں تاکہ اس کا مصداق موجود رہے، یہ غلط نہ ہو جائے تو اس سے کہا جائیگا کہ آپ کو اس کے سچا کرنے کی ضرورت نہیں، تم کو اس کا مکلف نہیں کیا گیا۔ قیامت میں آپ سے یہ سوال ہرگز نہ ہوگا کہ تم نے ہماری پیشین گوئی کے سچا کرنے کا اہتمام کیا تھا یا نہیں؟ بلکہ وہاں تو آپ سے ان امور کا سوال ہوگا جن کا امر کیا گیا ہے اور پیشین گوئی کے سچا کرنے کا آپ کو امر نہیں لہٰذا یہ جواب مسموع[1] نہ ہوگا۔ میں اس کی نظیر دنیا میں آپکو دکھلاتا ہوں، وہ یہ کہ پولیس میں مردم شماری کا تجربہ سے اوسط مقرر ہوتا ہے کہ اتنے آدمیوں میں اتنے بدمعاش اور جرائم پیشہ ضرور ہوتے ہیں، تو کیا کوئی مجرم مجسٹریٹ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو جرم اس لیے کیا ہے کہ پولیس کا قاعدہ میں نے دیکھا تھا کہ بدمعاشوں کا اوسط اتنا ہے تو میں نے اس اوسط کو پورا کرنا چاہا تاکہ یہ قاعدہ غلط نہ ہو جائے، اس لیے میں مجرم نہیں ہوں، بلکہ حقیقت میں خیر خواہ سرکار ہوں تو کیا مجسٹریٹ اس کا یہ عذر سن لے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ وکیل سرکار فوراً کہے گا کہ نالائق کیا تیرا نام بھی اوسط میں لکھا ہوا تھا؟ پھر تو اس میں کیوں داخل ہوا۔

---

[1] : سنا نہیں جائیگا۔

جی یہ اوسط تو واقعہ ہے قانون تو نہیں ہے یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ اوسط کو دیکھ کر خواہ مخواہ اس کے پورا کرنے کے لیے جرم کیا جاوے اسی طرح یہ پیشین گوئی حکم تکوینی[1] ہے حکم تشریعی[2] نہیں۔

اب میں اس سے زیادہ اس مسئلہ کی توضیح نہیں کر سکتا کہ سر قدر[3] میں خوض ہو جائے گا۔ میں تو اس حدیث کو پڑھ کر ہی پچھتایا کیونکہ اس کو پڑھ کر اتنا بڑا کام میرے سر پڑ گیا کہ دقیق اشکالات کو حل کرنا پڑا۔ مگر پچھتانے کی بھی کیا ضرورت ہے اگر میں اس حدیث کو پڑھ کر اشکالات رفع نہ کرتا تو خدا سلامت رکھے اردو سلمہ اللہ کو کبھی نہ کبھی اس کی بدولت یہ حدیث آپ کی نظر سے گذر جاتی۔ کیونکہ آج کل اردو میں حدیث و فقہ کی کتابیں ترجمہ ہو گئی ہیں تو کسی اور جگہ دیکھ کر آپ کو یہ شبہات واقع ہوتے اس لیے اچھا ہوا کہ میں نے سب کا جواب دیدیا۔

وکلاءِ شرع کی ضرورت

اور اس تقریر سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ قرآن و حدیث کا ترجمہ دیکھ لینا علماء سے مستغنی[4] نہیں کر سکتا۔ بتلایئے! اگر آپ اس حدیث کا ترجمہ دیکھ لیتے تو کیا اس سے یہ حقیقت آپ کی سمجھ میں آ سکتی تھی جواب سمجھ میں آئی، اور محض ترجمہ سے یہ اشکالات حل ہو سکتے تھے جو اس وقت حل ہوئے! کبھی نہیں، مگر حیرت ہے کہ آجکل اردو تراجم نے لوگوں کو علماء سے مستغنی کر دیا ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ اردو میں طب کی کتابوں کا بھی ترجمہ ہو گیا ہے، مگر با ایں ہمہ[5] اطباء سے استغناء نہیں ہوا، اور جو لوگ اردو رسائل طبیہ دیکھ کر اطباء سے مستغنی ہوئے بھی ہیں ان کو سب لوگ احمق سمجھتے ہیں، مگر یہاں اس حماقت

---

[1]:۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ شدہ۔ [2]:۔ شریعت کے مطابق فیصلہ شدہ۔
[3]:۔ مسئلہ قضاء و قدر میں غور و خوض ہوگا۔ [4]:۔ بے نیاز۔
[5]:۔ اس سب کے باوجود۔

میں سب مبتلا ہیں، جس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ آجکل بعض لوگ جو بندۂ اغراض ہیں اس کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں کو اطباء حقیقی و علماء حقیقی سے پھیر کر اپنی کتابوں کی طرف یا اپنی طرف مائل کریں۔ شاید یہاں کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ جب اُردو ترجمہ کے بعد بھی علماء سے استغناء نہیں پھر ترجمہ ہی کیوں کیا گیا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسائل شرعیہ میں دو دقتیں تھیں، ایک زبان کی، ایک مضمون کی، ترجمہ سے زبان کی دقت رفع ہوگئی اور یہ بھی بہت بڑا نفع ہے کہ آدھی محنت کم ہوگئی لیکن زبان اُردو ہو جانے سے مضامین کی دقت رفع نہیں ہوئی۔

دیکھئے! آجکل قانون سرکاری کا ترجمہ اُردو میں ہوگیا ہے، جس سے زبان انگریزی کے سیکھنے کی دقت تو کم ہوگئی، ہر اُردو خواں اس کو بے تکلف پڑھ سکتا ہے مگر کیا زبان اُردو ہونے سے مضامین کی دقت بھی رفع ہوگئی ؟ کہ ہر شخص اس کے ہر مقام کو خود ہی سمجھ لیا کرے، ہرگز نہیں، میں نے خود ایک بار قانون کی اُردو کتاب دیکھی تھی مگر ایک مقام کا مطلب نہ سمجھ سکا کچھ کا کچھ سمجھ گیا، پھر ایک وکیل نے اس کا مطلب صحیح بیان کیا، تب مجھے اپنی غلطی پر تنبہ ہوا، پھر قانون شرعی کے اُردو میں ہو جانے سے آپ وکلاءِ شرع سے کیونکر مستغنی ہو سکتے ہیں۔

غرض چونکہ آجکل اُردو میں رسائل دینیہ کی کثرت ہوگئی ہے اس لیے اندیشہ تھا کہ کسی کتاب میں یہ حدیث آپ دیکھ لیتے اور اشکالات پڑتے اس لیے میں نے اس وقت شبہات حل کر دیئے اب مطلع بے غبار ہے۔

نا اتفاقی کے ضرر کا درجہ

اب میں اپنی اصلی غرض کی طرف عَود[1] کرتا ہوں کہ نا اتفاقی بہت سخت مرض ہے۔ اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دن بدن ترقی پذیر ہے۔ ہمیں دوسری قوموں

---

[1] :۔ لوٹتا ہوں۔

سے تو کچھ غرض نہیں، اور سچ یہ ہے کہ ہم ان کی حالت کو جانتے بھی نہیں اور جان بھی لیں تو کیا کریں، گھر سے فرصت ہو تو کسی کی خبر لی جائے۔ یہاں ہم کو اپنے ہی گھر سے فرصت نہیں۔ اگر آپ کا ایک بھائی بیمار ہو اور ایک پڑوسی اور پڑوسی بھی بدخواہ[1] تو بھائی کو چھوڑ کر پڑوسی کے علاج کو آپ کبھی نہ دوڑیں گے۔ ہاں بھائی سے فراغت ہو جائے تو پھر یہ ہمت کی بات ہے کہ پڑوسی کا معالجہ بھی کر دیا جائے۔ مگر یہاں تو اپنے ہی گھر میں اپنے بھائی بیمار پڑے ہیں۔ ہم کو انہی کے علاج سے فرصت نہیں۔ ہمارا گھر اسلام ہے اور گھر والے اہلِ اسلام ہیں، سو خود مسلمانوں ہی میں نااتفاقی کا مرض دن بدن ترقی پر ہے، جس کا سبب زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کو نااتفاقی کا مذموم[2] و مضر[3] ہونا تو مسلّم[4] ہے مگر اس کا درجہ معلوم نہیں کہ اس کا ضرر[5] کس درجہ کا ہے، ورنہ کیا وجہ ہے کہ اب تک اس مرض میں کمی نہیں ہوئی حالانکہ رات دن سب کی زبان پر یہ بات آتی ہے کہ آجکل مسلمانوں کو تنزل ہے اور اس کی وجہ سب یہ بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں میں اتفاق نہیں۔ اور اتفاق کی ضرورت پر ہمیشہ تقریریں ہوتی ہیں، مگر پھر بھی نااتفاقی دور نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کے ضرر کا درجہ معلوم نہیں، اسی لیے اس سے اجتناب[6] کا اہتمام نہیں۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ اجتناب کا اہتمام اسی چیز سے کیا جاتا ہے جس کے ضرر کا درجہ معلوم ہو جائے۔

چنانچہ اگر کسی کو سنکھیا کا مضر ہونا تو معلوم ہو مگر درجہ معلوم نہ ہو تو اس کو اس سے اجتناب کرنے کا زیادہ اہتمام نہ ہوگا، اور جس کو درجہ معلوم ہو کہ سمِ قاتل[7] ہے وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ نااتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم کیا

---

[1]:۔ برائی چاہنے والا۔ [2]:۔ برا۔ [3]:۔ نقصان دہ۔
[4]:۔ تسلیم شدہ۔ [5]:۔ نقصان۔ [6]:۔ رکنے۔
[7]:۔ نقصان۔ [8]:۔ زہرِ قاتل۔

جائے۔ کیونکہ درجہ معلوم نہ ہونے ہی سے اس سے اجتناب کم ہو رہا ہے۔ اور اجتناب کم ہونے کے بعد ارتکاب ہونے لگا، اور ارتکاب کے بعد اب یہ حالت ہوگئی کہ بعض لوگوں کو نااتفاقی کی مذمت سے بھی کبیدگی[1] ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کو نااتفاقی کا مزہ پڑ گیا ہے، جو اب صفت لازمہ ہوگئی، اور ایسی صفات کو ذات سے لاعین[2] ولا غیر کا تعلق ہے تو صفت بمنزلہ ذات کے ہوگئی۔ اور اپنی ذات ہر اک کو محبوب ہے، اس لیے اس کی صفات بھی محبوب ہیں۔ اور محبوب کی مذمت کسی کو گوارا نہیں ہوتی تو اب وہ نااتفاقی کی مدح کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی مدح کیونکر کرے کیونکہ نااتفاقی کا مذموم ہونا سب کو مسلم ہے۔ اس کی مذمت کا انکار تو یہ کر ہی نہیں سکتا۔ تو اب اس کی کوشش کرتا ہے کہ یہ ثابت کرے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ نااتفاقی اور فساد ہی نہیں بلکہ اصلاح ہے۔ اب وہ حال ہو جاتا ہے وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِۙ قَالُوۡٓا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ○[3] جو کہ منافقین کی حالت میں وارد ہوا ہے۔ اب ان کو مالیخولیا ہو جاتا ہے اور مالیخولیا کی خاصیت یہ ہے کہ اس کا مریض اپنے کو مجنون نہیں سمجھا کرتا، پھر اس کو دوا کیوں کر پلائی جائے اور اسے کیونکر یقین دلایا جائے کہ تو مجنون ہے۔ اور یہ سارا فساد اس کا ہوا کہ اس شخص کو شروع ہی میں نااتفاقی کے ضرر کا درجہ معلوم نہ ہوا۔ اگر درجہ معلوم ہوتا تو قلت[4] اہتمام اور عدم مبالات[5] اور ارتکاب فساد کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس لیے میں نے اس وقت یہ حدیث اختیار کی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نااتفاقی کے ضرر کا درجہ

---

[1]:۔ ناگواری۔ [2]:۔ نہ اصل ذات نہ بالکل غیر۔
[3]: جب ان (منافقین) سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد برپا نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ ۱۲ منہ۔ البقرۃ آیت ۱۱۔ [4]:۔ اہتمام کی کمی۔
[5]:۔ لا پرواہی۔

حضرت والاؒ نے یہ وعظ جناب
حافظ سخاوت علی مرحوم کے مکان
کے صحن میں جو کہ مظفر نگر (یو۔پی
بھارت) میں واقع تھا۔
۲۸ ربیع الثانی سنہ ۱۳۴۱ھ کو تین گھنٹے
تک کرسی پر بیٹھ کر، اتفاق کی
خوبیوں اور اس کے اسباب و
حدود نیز شرائط و قیود اور نااتفاقی
کے مفاسد کے بارے میں فرمایا۔
مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم نے
اسے قلم بند فرمایا۔ سامعین کی
تعداد عورتوں کے علاوہ تقریباً
پانسو تھی۔

بتلایا ہے، فرماتے ہیں ایاکم و فساد ذات البین فانها هی الحالقة یعنی اپنے کو باہمی فساد سے بچاؤ، کیونکہ باہمی فساد مونڈنے والی چیز ہے اس میں ابہام وتفسیر کی بلاغت ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اول تو حالقہ فرمایا جس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ فساد کی وجہ سے سر کے بال منڈ جائیں گے۔ پھر سامع کو اس کے مطلب کا انتظار ہوا کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ ہم نے بارہا نااتفاقی کی ہے مگر سر کے بال کبھی نہیں گرے تو ابہام سے سامع کو تفسیر کا مشتاق بنا کر آگے فرماتے ہیں لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ بَلْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے سر کے بال منڈ جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اس سے دین منڈ جاتا ہے اور منڈنا کسے کہتے ہیں۔ منڈنا یہ ہے کہ خربوزہ سا سر نکل آئے، بال کا نشان تک نہ رہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ فساد باہمی سے دین کا بالکل صفایا ہو جاتا ہے۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نااتفاقی اور فساد باہمی کے ضرر کا درجہ بتلا دیا ہے اور واقعی اس سے زیادہ کیا ضرر ہوگا کہ اس سے دین کا صفایا ہی ہو جاتا ہے مگر قربان جائیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، کہ آپ کے عتاب میں بھی رحمت بھری ہے

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ۔۔۔ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

وعید میں عید

گو اس مقام پر حضور نے فساد باہمی پر بہت بڑی وعید فرمائی ہے، مگر ساتھ ساتھ اس میں امید کی بھی جھلک ہے۔ بالکل ہی ناامید نہیں، کیونکہ آپ نے فساد کو حالقہ فرمایا ہے۔ کہ یہ دین کو مونڈھ

له :۔ ظاہر ہوتا ہے۔ ۔۔ ۲ :۔ مواخذہ

۳ :۔ تم نے مجھے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تمہیں معاف کرے اچھا کہا۔ تیرے شیریں لبوں کے لیے جواب تلخ ہی زیبا تھا۔

۴ :۔ عذاب آخرت ۔۔ ۵ :۔ مونڈنے والا۔

دیتا ہے، اور مونڈنے سے اس وقت تو اُوپر سے صفایا ہو جاتا ہے مگر اندر جڑ باقی رہ جاتی ہے کہ اگر روز استرہ نہ پھیرا جائے تو اگلے دن کھونٹی نکل آتی ہے تو اس میں اس طرف اشارہ فرما دیا کہ اگر کوئی شخص روز روز منڈانے کا شغل نہ کرے تو چند روز میں کھونٹی نکل آئے گی۔ اس کے بعد بال اور بڑھیں گے پھر زلفیں ایسی ہوں گی کہ لوگ ان میں پھنسا کریں گے اور وہ حال ہوگا ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے　　　اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

ایک زبان والے نے اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا تھا کہ ہم اور تم اور میر صاحب اس کی زلفوں میں پھنس کر سب جیل خانہ چلا گیا (یہ تو ایک لطیفہ تھا) غرض کیا رحمت ہے کہ ایک ہی لفظ میں غضب بھی ہے اور رحمت بھی ہے۔ آپ نے تَحْلِقُ الدِّیْنَ فرما کر ڈرایا دھمکایا بھی ہے اور یہ بھی بتلا دیا کہ نا اُمید نہ ہونا فساد سے دین کی جڑ نہیں جاتی۔ اگر کوشش کرو گے تو جڑ سے شاخ اور شاخ سے پھل بھی نکل آویں گے۔ اے صاحبو! غضب کی حالت میں جس ذات کی یہ رحمت ہے ان کی رحمت تو کیا کچھ ہوگی اسی کو سعدی فرماتے ہیں ؎

نماند بعصیاں کسے در گرو　　　کہ دارد چنیں سید پیشرو [1]

بددعا بغلبۂ بشریت

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اَغْضِبُ کَمَا یَغْضَبُوْنَ فَاَیُّمَا رَجُلٍ اٰذَیْتُهٗ اَوْ شَتَمْتُهٗ اَوْ لَعَنْتُهٗ فَاجْعَلْهَا لَهٗ صَلٰوةً وَّ زَکٰوةً وَّ قُرْبَةً تُقَرِّبُهٗ بِهَا اِلَیْكَ۔ (اے اللہ! میں بشر ہوں مجھے بھی غصہ آجاتا ہے، جیسا اوروں کو غصہ آتا ہے۔ تو جس شخص کو دورانِ غضب میں کچھ ایذاء دوں یا برا بھلا کہوں یا بددعا کروں تو ان سب کو اس کے حق میں رحمت خاص اور سببِ تزکیہ اور موجبِ

[1] : گناہوں کی وجہ سے کوئی مقید نہیں رہے گا۔ جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسا سردار رکھتا ہو۔

قربت بنا دیجئے، جس سے آپ اسکو اپنا مقرب بنالیں۔

سُبحان اللہ! کیا رحمت ہے، فرماتے ہیں کہ اے اللہ میری بددُعا بھی دُعا ہی ہو کر لگے، تو آپ کی عجیب شان ہے کہ غضب میں بھی آپ رحمت ہی فرماتے ہیں۔ اس پر شاید کوئی خوش ہو کر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددُعا بھی دُعا ہی ہو کر لگتی ہے تو اب جتنی وعیدیں حضورؐ نے بیان فرمائی ہیں سب سے بے فکری ہے۔ کیونکہ آپ کی وعید میں بھی عید ہوتی ہے۔ ذرا کوئی اُردو خوان جو قرآن و حدیث و مسائل فقہ کا ترجمہ دیکھ کر علماء سے اپنے کو مستغنی[1] سمجھتے ہیں اس اشکال کا جواب تو دیدیں، انشاء اللہ مُنہ ہی تکتے رہیں گے اور کچھ جواب نہ آئے گا، بات یہ ہے کہ محض ترجمہ دیکھنے سے مضمون کی حقیقت منکشف[2] نہیں ہوتی، اور جب تک حقیقت منکشف نہ ہو، اس وقت تک اشکالات کا جواب بھی سمجھ میں نہیں آتا چنانچہ آپ نے اُردو کتابیں تو دینیات کی بہت پڑھی ہوں گی مگر ذرا اس کا جواب دیجئے، صاحبو! حقیقت کا انکشاف محققین کے پاس رہ کر ہوتا ہے۔ لیجئے میں اس شبہ کا جواب دیتا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ یہ حدیث انہی بددعاؤں کے متعلق ہے جو غلبۂ بشریت سے بحالتِ غضب[3] نکل جائیں۔ چنانچہ خود شروع میں اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ کا لفظ خود اس پر دال ہے کہ یہ ان بددعاؤں کے متعلق ہے جن کا منشاء بشریت ہے۔

بددعا بغلبۂ عقل

اور بددعا بغلبۂ عقل[4] تبلیغ کی حالت میں صادر ہو، ان کے بارے میں تو ایک حدیث میں یہ وارد ہے سِتَّۃٌ لَعَنْتُھُمْ وَلَعَنَھُمُ اللّٰہُ وَکُلُّ نَبِیٍّ یُجَابُ اَلْحَدِیْث رَوَاہُ الْبَیْھَقِی فِی الْمُدْخَلِ وَرَزِیْنٌ فِیْ کِتَابِہٖ (مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر)

---

[1]: بے نیاز۔ [2]: کھلتی۔
[3]: غصہ کی حالت میں۔ [4]: عقل کے غلبہ کے ساتھ۔

کہ جن شخصوں پر میں نے لعنت کی ہے اور خدا تعالیٰ بھی لعنت کرتا ہے اور ہر نبی کی درخواست قبول ہوتی ہے الیٰ آخرہٖ۔ اس میں تصریح ہے کہ میری بددعائے لعنت قبول ہوگی اور ان پر خدا تعالیٰ کی بھی لعنت ہوگی، غرض مخالفتِ احکام کے سبب سے جو بددُعا ہوگی اس کی یہ شان ہوگی۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود[1]

اور یہ شان ہوگی ؎

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استادِ ازل گفت بگو می گویم[2]

اور جب آپ کی بددعا حق تعالیٰ کی بددُعا ہے تو گویا یہ دُعا خود حق تعالیٰ ہی فرما رہے ہیں اور اس کی یہ شان ہوگی۔

چوں خُدا از خود سوال و گدکند پس دعائے خویشتن چوں رد کند[3]

اور مولانا پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ حضورؐ کی بددُعا کو حق تعالیٰ کی بددعا اور از خود سوال و گد گردن کیسے کہہ دیا۔ قرآن میں اس کی نظیر موجود ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ[4] جس کی تفسیر میں مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں، اِذَا قَرَءَ رَسُوْلُنَا جِبْرَئِیْلُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ[5]۔ یہاں حق تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کی قراءت کو اپنی قراءت فرما رہے ہیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا جبرئیل علیہ السلام سے کچھ کم ہیں؟ اگر آپ کے فعل دُعا کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جاوے تو بُعد ہی کیا ہے۔

---

[1]:۔ آپ کا فرمایا ہوا اللہ کا ہی فرمایا ہوا ہے اگرچہ عبداللہ کے مُنہ سے نکل رہا ہے۔ [2]:۔ آئینہ کے پیچھے کی طوطی کی طرح بنا دیا ہے جو استادِ ازل کہتا ہے کہہ دو وہی میں کہتا ہوں۔ [3]:۔ جب خُدا خود اپنے سے سوال اور مانگنے کا حکم کرتے ہیں پس چاہنے والوں کی دعا کو کیوں رد کریں گے۔ [4]:۔ القیامہ آیت ۱۸ جب ہم اسے پڑھیں تو آپ کی پیروی کریں۔ (بیان القرآن)

[5]:۔ جب ہمارا پیامی جبریل پڑھے تو تم اسکے پڑھنے کا اتباع کرو۔

صوفیاء کا صبر

لوگ صوفیوں پر مسئلہ وحدۃ الوجود میں اعتراض کرتے ہیں، وہ ذرا ابتلائیں کہ صوفیہ نے کیا بھوسہ ملا دیا ہے۔ وہ بھی وہی کہتے ہیں جو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ مگر صوفی بے چارے ہر زمانہ میں بدنام رہے ہیں، کیونکہ وہ خاموش اور صابر ہوتے ہیں، اور زمانہ کا قاعدہ ہے کہ لوگ صبر کرنے والوں کو زیادہ دباتے ہیں اور جو سامنے تن کر کھڑا ہو جاوے اس سے بھاگتے ہیں مگر معلوم بھی ہے وہ صبر کیوں کرتے ہیں۔ وہ صبر کر کے حق تعالیٰ کو اپنے ساتھ کرتے ہیں۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنا انتقام خود لے لیتا ہے تو حق تعالیٰ معاملہ کو اسی کے سپرد کر دیتے ہیں اور جو صبر کرتا ہے اس کی طرف سے حق تعالیٰ خود انتقام لیتے ہیں، پھر وہ انتقام کیسا ہو گا اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے، کہ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے لیے ایسے غضبناک[1] ہوتے ہیں جیسے شیر اپنے بچوں کے لیے غضبناک ہوا کرتا ہے، پھر کبھی تو دنیا میں بھی مزا چکھا دیتے ہیں اور کبھی آخرت پر پوری سزا کو ملتوی رکھتے ہیں، اور دنیا میں کبھی تو ایسی سزا دیتے ہیں جس کو یہ شخص بھی سزا سمجھتا ہے اور کبھی اس طرح میٹھی مار مارتے ہیں کہ یہ اسکو انعام سمجھتا ہے۔ چنانچہ ایک مجذوب کے کسی سپاہی نے ایک ہنٹر مار دیا، مجذوب نے بددعا دی کہ اے اللہ! اس کو تھانہ دار کر دے۔ وہ چند ہی روز میں تھانہ دار ہو گیا، اب تو بڑا خوش ہوا کہ مجذوب کی دعا قبول ہو گئی، چل کر اس سے اپنی خطا معاف کرانا چاہیئے اور کچھ ہدیہ پیش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ مٹھائی لے کر گیا، غنیمت ہے کہ اس نے دوسرا ہنٹر نہ مارا، ورنہ آجکل کے عقلاء تو شاید ایسا ہی کرتے، کہ جب اس کے ایک ہنٹر مارنے سے یہ عہدہ ملا تو شاید اور مارنے سے کوئی دوسرا بڑا عہدہ مل جائے گا۔

---

[1] : غصہ والا۔

غرض جب وُہ مٹھائی لے کر گیا اور کہا جی آپ کی دُعا سے مجھے وہی عہدہ مل گیا جو آپ نے فرمایا تھا۔ اس کی خوشی میں یہ ہدیہ لایا ہوں اور اپنی گستاخی سے شرمندہ ہوں کہ میں نے بُرائی کی اور آپ نے بھلائی کی دُعا کی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے کچھ خدمت لیجئے، مجذوب نے کہا ہم کو ایسے بچھو لادو جو کالے ہوں اور ایک ایک بالشت لمبے ہوں۔ اس نے کئی روز بعد آکر کہا حضور ایسے بچھو تو ملتے نہیں۔ مجذوب نے کہا چل میں بتلاؤں ایک قبر پر لے گیا اور اس کو کھودا تو ایسے ایسے سینکڑوں بچھو اسی لاش کو لپٹے ہوئے دیکھے، دیکھ کر ڈر گیا اور معلوم ہوا کہ یہ ایک ظالم تھانہ دار کی قبر ہے۔ اس وقت مجذوب نے کہا بچہ میں نے دُعا نہیں دی تھی یہ بد دعا دی تھی کہ تجھ کو بھی ایسی ہی سزا ملے۔ کیونکہ اب تو حکومت کرکے مخلوق پر ظلم کریگا تو قبر میں بالشت بھر لمبے بچھو تجھے لپٹیں گے۔ تو یہ سمجھا کہ میں نے تیرے واسطے بھلائی کی دُعا کی تھی۔

تو صاحبو! کبھی اہل اللہ کی ایذاء[1] رسانی سے حق تعالیٰ ایسی میٹھی سزا بھی دیا کرتے ہیں جسکو آپ نعمت سمجھتے ہیں، اور حقیقت میں وُہ وبالِ جان ہے۔ بس اہل[2] اللہ کو تکلیف پہنچا کر مطمئن نہ رہنا چاہیئے۔ الغرض! صوفیہ چونکہ صابر ہوتے ہیں اس لیے ان پر سب اعتراض کرتے ہیں ورنہ ان کا یہ قول (یعنی وحدۃ الوجود کا مسئلہ) شریعت کے خلاف نہیں اگر وقت میں گنجائش ہوتی تو میں اس کو ذرا البسط[3] کے ساتھ بیان کرتا۔ مگر اس وقت ایک ہی آیت پر اکتفا کرتا ہوں۔

با اُمید وعید

بہر حال تبلیغ کے ذیل میں جو وعیدیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں، وُہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں لہٰذا ان سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے، انہی وعیدوں میں سے ایک وعید یہ

---

[1] :۔ تکلیف دینے۔ [2] :۔ اللہ والوں۔
[3] :۔ تفصیل۔

ہے جو حضور ؐ نے فساد[1] ذات البین کے متعلق بیان فرمائی ہے، مگر عارفین کا مسلک ہے کہ وہ وعید کا بیان کرتے ہوئے نا امید نہیں کیا کرتے، کیونکہ وعید کا جو مقصود ہے یعنی آئندہ کے لیے زجر[2] اور اصلاح وہ نا امید کرنے سے فوت ہو جاتا ہے، ہو نا امیدی سے اول تعطل کی نوبت آتی ہے، کہ آدمی غلبۂ حزن کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا پھر تعطل کے بعد گناہوں پر جرأت ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ وعید خالص کے سننے سے آدمی مر بھی جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت غوث اعظم ؒ کا واقعہ ہے کہ آپ نے چالیس سال تک رحمت حق کا بیان فرمایا، پھر خیال ہوا کہ شاید لوگوں کو اعمال سے بے فکری ہونے لگی ہوگی، اس لیے اس کے بعد آپ نے ایک دن خالص ترہیب[3] کا بیان فرما دیا، اس کا یہ اثر ہوا کہ مجلس وعظ میں سے کئی جنازے اٹھائے گئے۔ وہ بیان سن کر ان کے دل پھٹ گئے، الہام ہوا کہ اے عبد القادر! کیا ہماری رحمت اتنی ہی تھی کہ چالیس برس میں اس کا بیان ختم ہو گیا، ہمارے بندوں کو مار دیا۔ اسی لیے محققین غضب کے ساتھ رحمت کا بیان بھی کرتے ہیں اور وعید کے ساتھ امید کو بھی ملا دیتے ہیں تاکہ نا امیدی نہ ہو اور نوبت بہ ہلاک[4] نہ پہنچے، چنانچہ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فساد ذات البین پر جو وعید بیان فرمائی ہے اس میں لفظ تحلق اختیار فرمایا ہے۔ جس میں وعید کے ساتھ امید بھی ملی ہوئی ہے۔ کہ اس سے دین منڈتا ہی ہے جڑ سے زائل نہیں ہوتا کیونکہ مونڈنے سے پھر بھی بال نکل آتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ پہلے سے بھی سخت نکلتے ہیں، مگر خدا کے لیے تم اس غرض سے مونڈنے کا ارادہ نہ کیجیو، کیونکہ شاید اسی دن خاتمہ ہو جائے تو منڈے کے منڈے ہی رہ جاؤ گے۔ پس اس وعید سے ڈرنا چاہیئے اور قصداً نا اتفاقی پر اقدام نہ کرنا چاہیئے اور اگر کبھی صادر ہو جائے تو اصلاح سے نا امید بھی نہ

---

[1] :۔ باہمی نا اتفاقی۔ [2] :۔ سزا۔ [3] :۔ ڈرانے۔
[4] :۔ ہلاکت تک۔

ہونا چاہیئے۔

مفید نااتفاقی یہاں سے ایک مسئلہ اور مستنبط[1] ہوا، وہ یہ کہ آج کل جو عموماً اتفاق کے فضائل اور نااتفاقی کی مطلقاً مذمت بیان کی جاتی ہے اور علماء بھی عموماً اس مرض میں مبتلا ہیں یہ غلط ہے۔ کیونکہ حدیث سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نااتفاقی اس واسطے مذموم[2] ہے کہ یہ دین کو مضر[3] ہے۔ اور اگر دین کو مفید ہو، گو دنیا کو مضر ہو، تو وہ مذموم نہیں۔ چنانچہ ایک نااتفاقی وہ بھی ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار کیا تھا حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

[4]قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ الآیۃ۔

ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے اپنی قوم سے صاف کہدیا، کہ ہم میں اور تم میں عداوت[5] و بغض ہمیشہ کے لیے پیدا ہو چکا ہے، جب تک کہ تم اللہ وحدہٗ پر ایمان نہ لاؤ۔ تو کیا اس نااتفاقی کو بھی کوئی بھی مذموم کہہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اس کے مقابلہ میں ایک اتفاق وہ تھا جس کے بارہ میں ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں۔

---

[1]:۔ نکلا۔ [2]:۔ بری۔ [3]:۔ نقصان دینے والی۔

[4]:۔ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین میں تمہارے لیے اچھا نمونہ ہے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے بیزار ہیں اور اس چیز سے جس کو خدا کے علاوہ تم پوجتے ہو۔ ہم منکر ہوئے تم سے اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ اکیلے پر۔ (الممتحنہ آیت ۴)۔

[5]:۔ دشمنی۔

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ[1]

اس سے صاف معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں جو کفار تھے ان میں باہم اتفاق و اتحاد کامل تھا، مگر کیا اس اتفاق کو کوئی محمود[2] کہہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس اتفاق کی بنیادیں اکھاڑ کر پھینک دی تھیں، کیونکہ یہ اتفاق خلاف حق پر تھا۔ پس خوب سمجھ لو کہ اتفاق صرف اسی وقت مطلوب و محمود ہے، جبکہ دین کو مفید ہو اور نا اتفاقی جبھی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو۔ اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نا اتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت وہ نا اتفاقی مطلوب ہوگی۔

اہل دنیا تک اپنے معاملات میں اس کو خوب سمجھتے ہیں، چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعیٰ علیہ عدالت سے مرافعہ[3] کرتے ہیں تو اس وقت دونوں سے کبھی نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوے سے دستبردار ہو جاؤ، کیونکہ اس دعوے سے تمہارے اندر نا اتفاقی پیدا ہوگئی ہے، اور نا اتفاقی مذموم ہے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص خلاف حق پر ہو، اس سے کہا جاتا ہے کہ تم حق کی طرف رجوع کرو اور ناحق پر اصرار کو چھوڑ دو۔ بلکہ بعض معاملات میں اگر کبھی صاحب حق دعوے سے دست بردار بھی ہو جائے، تو گورنمنٹ مدعی ہو جاتی ہے اور وہ حق کی حمایت کرتی ہے۔

[1]:۔ اور فرمایا بیشک تم نے اللہ کے علاوہ پکڑ لیا بتوں کو دنیاوی زندگی میں آپس کی دوستی و محبت کے لیے پھر قیامت کے دن تم ایک دوسرے کا انکار کروگے اور ایک تم کا دوسرے پر لعنت کریگا اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ کی آگ ہے۔ (العنکبوت آیت ٢٥)

[2]:۔ پسندیدہ۔ [3]:۔ اپنے مقدمہ کا فیصلہ۔

حمایتِ حق

صاحبو! اگر نااتفاقی مطلقاً مذموم ہے تو چاہیئے کہ جب کوئی دعوٰی عدالت میں دائر ہو تو جج مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو سزا کر دیا کرے، کیونکہ نااتفاقی کے مجرم دونوں ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا، اور نہ عقلاء ایسی رائے دے سکتے ہیں، بلکہ یہاں سب یہ کہتے ہیں کہ گو نااتفاقی دونوں طرف سے ہے مگر ایک طرف سے حمایت حق کے لیے ہے اور دوسری طرف سے حمایت باطل کے لیے، پس تفتیش و تحقیق کے بعد جو شخص حق پر ہو اس کی ڈگری ہونا چاہیئے، اور عدالت کو اس کا ساتھ دینا چاہیئے یہاں تو سب کا اتفاق ہے کہ نااتفاقی مطلقاً مذموم نہیں، مگر افسوس! دین کے معاملہ میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا۔ بلکہ یہاں دونوں سے کہتے ہیں کہ نااتفاقی چھوڑ دو اور اتفاق پیدا کرو۔

صاحبو! آخر یہاں یہ کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ ان دونوں میں سے کس کی نااتفاقی حمایت حق کے لیے ہے اور کس کی حمایت باطل کے لیے، پھر جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جائے اور جو باطل پر ہو صرف اسی کو دبایا جائے۔ اور آپ جو دونوں کو اتفاق کا امر کرتے ہیں تو بتلایئے صاحب حق صاحب، باطل کے ساتھ کیونکر اتفاق کر لے۔ دونوں طرف سے اگر اتفاق ہو گا تو عقلاً اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ صاحبِ حق حق کو چھوڑ دے اور دونوں باطل پر ہو جائیں یعنی دیندار دین کو چھوڑ کر بد دین ہو جائے، ایک یہ کہ دیندار تو دین پر قائم رہے اور بد دین بد دینی چھوڑ دے، تیسری صورت یہ ہے کہ کچھ دیندار تو دین کو چھوڑ دیں اور کچھ بد دین بد دینی کو چھوڑ دیں۔

اس طرح دونوں طرف سے اتفاق ہو سکتا ہے، اب عقلاء خود فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کون سی صورت عقل کے مطابق ہے، یقیناً صرف دوسری ہی صورت کو عقل کے مطابق کہا جائے گا کہ دیندار تو دین پر قائم رہے اور بد دین بد دینی کو چھوڑ دے، اور اس کا حاصل یہی ہے کہ دیندار کو تو بد دینی سے نااتفاقی کا حق ہے مگر

بد دین کو دیندار سے نا اتفاقی کا حق نہیں، بلکہ اس کو دیندار کے ساتھ اتفاق کرنا چاہیئے
صاحبو! یہ وُہ افتراق ہے جو حضورِ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیدا کیا ہے،
کیونکہ آپ کی نبوّت سے پہلے سب لوگ کفر پر متفق تھے، آپ نے اگر اس اتفاق
کو توڑ دیا اور باپ بیٹوں کو باہم جُدا جُدا کر دیا اور یہ وُہ افتراق ہے جس کو حق تعالیٰ
بشارت کے طور پر بیان فرماتے ہیں۔ يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا
اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ۔ اس آیت
میں حق تعالیٰ نے فرقان کو مایۂ بشارت بتلایا ہے، جس کو تقوائے پر مرتب فرمایا
ہے، اور اسی لیے قرآن کا ایک لقب فرقان بھی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ قرآن
ہمیشہ جوڑتا ہی نہیں بلکہ کہیں جوڑتا ہے اور کہیں توڑتا ہے۔ جو لوگ حق پر ہوں
ان کے ساتھ وصل[2] کا حکم ہے اور جو باطل پر ہوں ان کے ساتھ فصل[3] کا حکم ہے۔
پس یہ سخت غلطی ہے جس میں لوگ آجکل مبتلا ہیں، کہ جہاں دو جماعتوں میں اختلاف
دیکھتے ہیں دونوں کو موردِ[4] ملامت بنانے لگتے ہیں کہ تم کیسے مسلمان ہو کر آپس
میں اختلاف کرتے ہو، اور دونوں کو باہم اتفاق پر مجبور کرتے ہیں، جس کا مطلب
سوا اسکے اور کیا ہے کہ دیندار کو دین چھوڑ کر بد دین ہو جانا چاہیئے اور صاحبِ حق
حق کو چھوڑ کر باطل طریقہ اختیار کرے، اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے، بلکہ مقتضائے[5]
عقل یہ ہے کہ جب دو جماعتوں یا دو شخصوں میں اختلاف ہو تو اوّل یہ معلوم کیا جائے
کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون، جب حق متعین ہو جائے تو صاحبِ حق سے
کچھ نہ کہا جائے بلکہ اس کا ساتھ دیا جائے اور صاحبِ باطل کو اس کی مخالفت سے

---

[1]:۔ اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلے کی
چیز دیگا اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دیگا۔ (بیان القرآن) الانفال آیت ۲۹۔
[2]:۔ ملنے۔ [3]:۔ جُدا ہونے۔ [4]:۔ ملامت کے لائق۔
[5]:۔ عقل کا تقاضا۔

روکا جائے۔ قرآن میں اس پر ایک جگہ نص ہے فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ[1]

حلِ اشکال اور اگر آپ کو تحقیقِ حق کی فرصت یا لیاقت نہیں تو آپ سے دخل در معقول دینے کو کس نے کہا ہے، اپنے گھر بیٹھئے اور تحقیق سے پہلے کسی کو بُرا نہ کہیئے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ نہ اتفاق مطلقاً محمود ہے اور نہ اختلاف مطلقاً مذموم ہے تو اب اس حدیث پر سوال وارد ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِیَّاکُمْ وَفَسَادَ ذَاتِ الْبَیْنِ ہی کیوں فرمایا۔ کسی جگہ اِیَّاکُمْ وَصَلَاحَ ذَاتِ الْبَیْنِ بھی فرمانا چاہیئے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زیادہ تر فساد[2] نا اتفاقی سے ہوتا ہے، اتفاق سے فساد کم ہوتا ہے۔ کیونکہ اتفاق کی حالت میں قوائے سبعیہ[3] بہیمیہ کو سکون ہوتا ہے، ہیجان نہیں ہوتا اور معاصی زیادہ تر قوائے بہیمیہ کے ہیجان ہی سے ہوتے ہیں۔ تو جب ان کو سکون ہوگا اس وقت معاصی کا صدور کم ہوگا۔

---

[1] الحجرات آیت ۹۔ تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے۔ (بیان القرآن)۔ [2] اس جواب کا حاصل منشاءِ اشکال کو تسلیم کرکے جواب دینا ہے۔ منشأ اشکال یہ تھا کہ سائل نے لفظِ فساد کو اختلاف اور افتراق کا ہم معنی سمجھا ہے اس لیے شبہ کرتا ہے کہ حدیث صرف افتراق ہی سے بچنے کی تاکید کیوں ہے حضرت حکیم الامت نے ایک دوسرے وعظ میں اس شبہ کا جواب منشأ اشکال کو منع کرکے بھی دیا ہے، کہ سائل کا فساد کو افتراق و اختلاف کا مرادف سمجھنا غلط ہے، بلکہ فساد کے معنی ہیں۔ حالت کا اعتدال شرعی سے نکل جانا اور یہ افتراق ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ کبھی اتفاق سے بھی فساد ہوتا ہے۔ اس وعظ میں خلاف ذات البین کے بجائے حدیث میں فساد ذات البین وارد ہونے سے ہی یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ اختلاف فی نفسہٖ مذموم نہیں بلکہ فساد مذموم ہے پس اگر کسی وقت اتفاق سے فساد ہونے لگے اس وقت وہ اتفاق بھی مذموم ہو جائے گا۔ فلیتنبہ ۱۲۔ ظ

[3] درندوں اور جانوروں کی قوتیں۔

اورنا اتفاقی میں ان قوٰی کے اندر اشتعال و ہیجان ہوتا ہے اس وقت زیادہ گڑبڑ ہوتی ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الا ھو فانہ ھو کے لحاظ سے فساد ذات البین کے ضرر پر خصوصیت کے ساتھ متنبہ فرمایا۔ کیونکہ اس سے واقعی دین کا صفایا ہو جاتا ہے۔

گناہ کے کام میں اتفاق

اور اتفاق اگر معصیت میں بھی ہو تو گو خاص اس کام میں وہ اہل اتفاق کو ضرر پہنچا دے گا، مگر اس کا ضرر دوسروں تک متعدی نہ ہوگا اور پھر وہ ضرر مقصود بھی ایک دوسرے سے ارادۃً و قصداً نہ پہنچے گا۔ بلکہ اس دوستی کی وہ مثال ہوگی جیسے ایک شخص نے ریچھ سے دوستی کی تھی کہ تعلیم سے اس کو مہذب بنایا تھا۔ یہاں تک کہ آقا صاحب سو جاتے تو ریچھ کھڑا ہو کر پنکھا جھلتا۔ لوگوں نے منع کیا کہ میاں جانور جانور ہی ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں، سونے کی حالت میں اس سے خدمت لینا مناسب نہیں۔ اس نے کہا واہ میرا ریچھ تعلیم یافتہ ہے اس سے کچھ اندیشہ نہیں۔ ریچھ کے تعلیم یافتہ ہونے پر ایک اور لطیفہ یاد آیا۔ رڑکی میں ہمارے ماموں صاحب نے بارش اور کیچڑ کے دن ایک صاحب کو دیکھا کہ پھرک پھرک تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ماموں صاحب نے کہا صاحب ذرا سنبھل کر چلیے کیچڑ زیادہ ہے۔ کہا میں اقلیدس[1] کے قاعدہ سے چل رہا ہوں، میں گر ہی نہیں سکتا۔ یہ کہہ کر تھوڑی دور چلے تھے کہ دھڑام سے گرے ماموں صاحب نے فرمایا کہیے صاحب اب اقلیدس کی کون سی شکل بنی؟ بے چارے کھسیانے ہو گئے۔ تو جیسے ریچھ تعلیم یافتہ تھا، ایسے ہی ان حضرات کے پیر تعلیم یافتہ تھے۔ پھر جس طرح ان کے پیروں نے دھوکہ دیا، ایسے ہی ریچھ نے دھوکہ دیا۔

کہ ایک دن آقا صاحب سو رہے تھے اور ریچھ پنکھا جھل رہا تھا کہ ایک مکھی

---

[1] :۔ جو ضروری ہو اسکو مقدم کریں۔ [2] :۔ جومیٹری۔

ناک پر آکر بیٹھی، ریچھ نے اس کو اُڑا دیا وہ پھر آ بیٹھی ریچھ نے پھر اڑا دیا۔ بعض مکھی بڑی لیچڑ ہوتی ہے کتنا ہی اُڑاؤ پھر آ بیٹھتی ہے یہاں تک ریچھ اُڑاتا اُڑاتا عاجز آگیا اور غصّہ میں ایک پتھر اُٹھا کر لایا پھر جو مکھی آکر بیٹھی تو آپ نے تاک کر ناک پر پتھر مارا مکھی تو نہ معلوم مری یا اُڑ گئی مگر آقا کے بھیجے کا بھرتا ہو گیا۔

تو جو لوگ کسی گناہ کے کام میں اتفاق کرتے ہیں ان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے کہ وہ ضرر پہنچانے کا قصد تو نہیں کرتے، جیسا ریچھ نے آقا کے مارنے کا قصد نہ کیا تھا۔ بلکہ اس نے تو آقا کے دشمن کو مارنا چاہا تھا، مگر بدون ارادہ[1] کے ان کے ہاتھ سے ضرر پہنچ جاتا ہے اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم سے کیا ضرر پہنچا۔

خدام مشائخ کی حاشیہ آرائی

خصوصاً یہ علماء و مشائخ کے دوست ان کا ستیاناس کر دیتے ہیں، خادم منہ پر تعریف کرتے ہیں اور بزرگ صاحب پھنگرتے ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

[2] تن قفس شکل ست اما خار جاں — از فریبِ داخلاں و خارجاں
اینت گوید نے منم انباز تو — آفت گوید نے منم ہمراز تو
او چو بیند خلق را سرمستِ خویش — از تکبر می رود از دست خویش

یہ تو شہرت سے دینی ضرر ہوتا ہے، آگے فرماتے ہیں کہ اس سے دنیوی ضرر

---

[1] بغیر ارادہ۔

[2] بدن کی مثال ایک پنجرے کی ہے باہر کے لوگ
داخل و خارج کے فریب کا شکار ہیں
یہ کہتا ہے کہ میں تیرا شریک نہیں
وہ کہتا ہے کہ میں تیرا ہمراز نہیں
وہ جب مخلوق کو اپنے ظاہرے مست دیکھتا ہے
تو تکبر کی وجہ سے آپے سے باہر ہو جاتا ہے

بھی ہوتا ہے ، وہ یہ کہ مشہور آدمی پر مخلوق کا طعن و حسد اور رشک اور غصہ اس طرح برستا ہے جیسے مشک کے دہانے سے پانی گرتا ہے۔

[1] چشمہا و خشمہا و رشکہا بر سرت ریزد چو آب از مشکہا

آگے گمنامی کی ترغیب دیتے ہیں کہ جہاں تک ہو شہرت سے بچو، اور اس طرح رہو کہ کوئی تم کو جانے بھی نہیں ؎

[2] اشتہار خلق بند محکم ست بند او از بند آہن کے کم ست
خویش را رنجور ساز و زار زار تا ترا بیروں کنند از اشتہار

مگر یہ وہ شہرت ہے جو اختیار اور طلب سے حاصل ہو، اور جو شہرت غیر اختیاری ہو وہ نعمت ہے۔ بعضے اللہ کے بندے گمنام ہونا چاہتے ہیں اور اپنے کو مٹاتے رہتے ہیں، مگر جتنا وہ اپنے کو مٹاتے ہیں اور زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں، ان کو شہرت سے ضرر نہیں ہوتا، کیونکہ اس صورت میں حق تعالیٰ کی مدد ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ بہر حال مذموم اتفاق کے یہ دوست بہت مضر ہوتے ہیں۔ مگر باایں ہمہ[3] دوستی کے مفاسد[4] بہ نسبت اس دشمنی کے جو نا اتفاقی میں ہوتی ہے بہت کم ہیں۔ مثلاً دوستی میں ایک دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی اور دشمنی میں غیبت کا بازار گرم ہوتا ہے، یہ تو دینی ضرر ہوا، پھر یہ نہیج کے نمام[5] اس آتشیں[6] حمام کو دوسرے کے پاس لے جاتے ہیں اور ان باتوں کو مع حاشیہ کے، جو بالکل غیر واقعی ہوتا ہے اس کے سامنے نقل کرتے ہیں۔

---

[1]:۔ لوگوں کی نظریں غصہ اور اشک اپر ایسے برستے ہیں جیسے مشکوں سے پانی۔
[2]:۔ لوگوں میں مشہور ہونا یہ بھی مضبوط قید ہے۔ یہ قید بیڑیوں کی قید سے کہاں کم ہے اپنے آپکو غمگین رونے والا بناؤ تاکہ تجھے لوگ شہرت کی قید سے باہر کریں۔
[3]:۔ اس کے باوجود۔ [4]:۔ فساد۔ [5]۔ چغل خور۔
[6]:۔ دہکتے حمام۔

اب تو متن کے لیے حاشیہ ضروری ہی ہو گیا ہے، اور ان حواشی کے غیر واقعی ہونے کا مجھ کو تو اس قدر تجربہ ہو گیا ہے کہ میں نے جب کسی واقعہ کی تحقیق کی ہے تو بات اتنی نہیں نکلتی جتنی کہی گئی تھی۔ پھر باوجودیکہ ہر تجربہ کار کا اس پر اتفاق ہے کہ نقل کرنے والے حاشیہ چڑھا کر بات کو نقل کرتے ہیں، مگر پھر بھی سُنی سُنائی بات پر اعتماد کر لیا جاتا ہے اور اس کی تحقیق کوئی نہیں کرتا، بلکہ بعض تو تحقیق سے رکتے ہیں، تا کہ یہ بات کہیں جھوٹی ثابت نہ ہو جائے پھر سارا مزہ ہی جاتا رہے گا۔

غیبت کا نسب نامہ

اب غیبت سے دوسرے تک بات پہنچی اور اس کے دل میں اول کبیدگی[1] پیدا ہوئی، پھر وہ بھی اس کی غیبت کرتا ہے اور وہ بھی بیچ والوں کی بدولت پہلے شخص تک پہنچ جاتی ہے۔ اس عداوت[2] میں اور ترقی ہو جاتی ہے۔ تو غیبت عداوت کا باپ بھی ہے اور بیٹا بھی۔ یعنی کبھی عداوت سے غیبت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی غیبت سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا نسب ایسا بیہودہ ہو اس کی بیہودگی کے لیے یہی بات کافی ہے، پھر جب کوئی کسی کے درپے ہو جاتا ہے تو مشاہدہ ہے کہ دین کا خیال بالکل نہیں رہتا۔ اب نہ ایذا[3] سے دریغ[4] ہے نہ جھوٹ اور فریب سے، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دشمن کو ضرر پہنچ جائے، چاہے اُس کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ کیوں نہ ہو جائے، پھر اس کے لیے ہر ممکن تدبیر سوچی جاتی ہے۔ خواہ دین اور حیا اسکی اجازت دے یا نہ دے۔ کیونکہ آجکل شرافت تو رہی نہیں، ہمارے ماموں صاحب کا اس کے متعلق خوب شعر ہے ؎

شر و آفت کا ہے مجموعہ شرافت ہے کہاں ۔۔۔ ست ریاست سے گیا صرف ریا باقی ہے

---

[1]: رنجیدگی۔ [2]: دشمن۔
[3]: تکلیف پہنچانا۔ [4]: جھجک۔

اگر انسان میں دین بھی نہ ہو مگر شرافت ہو تو جب بھی بہت سے بیہودہ کاموں سے بچا رہتا ہے، اور جب نہ دین ہو نہ شرافت تو اب اس سے کسی کام سے رکنے کی اُمید نہیں۔ آجکل شرافتِ[1] نسب گو باقی ہے، مگر شرافتِ اخلاق نہیں رہی، اسی لیے دشمنی میں انسان کسی قسم کی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔

خصوصاً عورتوں میں تو یہ مرض بہت زیادہ ہے، گو ان کی دشمنی شدید تو نہیں ہوتی کیونکہ یہ دشمنی میں کسی کا خون نہیں کرتیں، عدالت نہیں کرتیں۔ مگر یہ ان کا کمال نہیں بلکہ پردہ کا کمال ہے جس کی وجہ سے ان کی چادر سے باہر نکلنے کی قوت نہیں اور اسی میں خیر ہے۔ اگر پردہ نہ ہو تو پھر آپ دیکھیں یہ کیا ستم ڈھاتی ہیں۔ آجکل لوگ اس پردہ کے بہت پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن میں اس کا ثبوت کہاں ہے۔ میں اس وقت تنگیٔ وقت کے سبب آپ کے سامنے حدیث و قرآن تو پیش نہیں کرتا، مگر ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ خُدا کے لیے اس پردہ کو نہ اٹھایئے۔ ورنہ وُہ مفاسد پیدا ہوں گے جن کا انسداد[2] قبضہ سے باہر ہو جائے گا۔ پھر آپ تجربہ کے بعد خود پردہ کرنا چاہیں گے، مگر اُس وقت ناکامی ہو گی۔

میں آپ سے ایک موٹی بات کہتا ہوں وُہ یہ کہ خُدا تعالیٰ نے جن کو مجنون[3] بنایا ہے ان کو آپ خود قید کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نقصِ[4] عقل موجبِ قید ہے۔ جب یہ بات مُسلّم ہو گئی تو عورتوں کے لیے بھی اسی وجہ سے قیدِ پردہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کا بھی ناقص العقل[5] ہونا مُسلّم ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہونا چاہیئے کہ جیسا نقص ہو ویسی ہی قید ہو مجنون[6] کامل کے لیے قید بھی کامل ہوتی ہے، کہ ایک کوٹھڑی میں بند کر دیتے ہیں ہاتھ پیر باندھ دیتے ہیں اور مجنون[7] ناقص کے

۱:۔ خاندانی شرافت۔ ۲:۔ روکنا۔
۳:۔ دیوانہ ۴:۔ عقل کی کمی۔ ۵:۔ کم عقل ہونا
۶:۔ مکمل دیوانے۔ ۷:۔ کم دیوانے۔

لیے قید ناقص ہونا چاہیئے کہ اسکو بلا اجازت گھر سے نکلنے کا اختیار نہ دیا جائے اور جب جائے ڈولی یا گاڑی میں جائے۔

باقی تعلیم کے لیے پردہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے، تعلیم پردہ میں بھی ہو سکتی ہے، اگر بے پردہ ہونے کو تعلیم میں دخل ہوتا، تو ساری باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہوتیں، مگر تجربہ یہ ہے کہ وہ تعلیم میں کسی پردہ والی کے برابر بھی نہیں۔ اور اگر کسی خاص قوم میں باہر پھرنے والیاں تعلیم یافتہ ہوں، تو اوّل تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا ان کی عورتوں پر بے پردگی کی وجہ سے کوئی بُرا اثر نہیں ہوا، تحقیق کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ اس آزادی نے ان کے اخلاق وعفت[1] پر کتنا بُرا اثر ڈالا ہے، پھر ایسی تعلیم کو لے کر کیا چولہے میں ڈالے، دُوسرے وہاں باہر پھرنے کو تعلیم میں دخل نہیں ہوا، بلکہ تعلیم میں دخل اس بات کو ہے کہ اس قوم کو تعلیم نسواں کا اہتمام ہے۔ انہوں نے اپنی عورتوں کو تعلیم کی غرض سے بے پردہ نہیں کیا بلکہ وہ تو بے پردہ پہلے ہی سے تھیں۔ کیونکہ اس قوم میں ہمیشہ ہی سے بے پردگی کا رواج ہے۔ اگر بے پردگی کو تعلیم میں دخل ہوتا تو چاہیئے یہ تھا کہ ان کی عورتیں ہمیشہ ہی سے تعلیم یافتہ ہوتیں۔ حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ اب ہی کچھ زمانہ سے ان میں تعلیم پیدا ہوئی ہے، جب سے ان کو تعلیم کا اہتمام ہوا ہے، اور اس سے پہلے عورتیں تو کیا ان کے مرد بھی جاہل وحشی تھے۔ جیسا کہ تاریخ اس پر شاہد ہے۔

پس معلوم ہوا کہ تعلیم کا اصل مدار اہتمام پر ہے، تو آپ بھی اہتمام کیجئے اور پردہ میں رکھ کر ہی اپنی عورتوں کو پڑھایئے۔ یقیناً تعلیم یافتہ ہو جائیں گی۔ آخر ایک زمانہ میں مسلمانوں کی عورتیں بھی تو بہت تعلیم یافتہ ہو چکی ہیں۔ حالانکہ اُس وقت بھی پردہ موجود تھا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عروج کے زمانہ میں کتنی عورتیں محدث اور مفسر اور ادیب، عالم ہوئی ہیں۔ (۱۲ جامع)

[1]:۔ پاکدامنی۔

مگر عورتوں کو پردہ میں رکھ کر بھی صرف دینیات کی تعلیم دینا چاہیئے۔ جغرافیہ اور تاریخ نہ پڑھانا چاہیئے ورنہ ان کو بھاگنے کے راستے معلوم ہو جائیں گے پھر وہ گھر سے ایسی جائیں گی کہ پتہ بھی نہ دیں گی۔

غرض! پردہ کی وجہ سے عورتوں کی نااتفاقی شدید تو نہیں ہوتی، مگر مدید[1] ہوتی ہے کہ ان میں باہم کشیدگی ہوتی ہے تو زمانہ دراز تک اس کا سلسلہ چلتا ہے نیز ان میں ایک ایسی بُری عادت ہے کہ جب کسی بات پر لڑائی ہوگی تو پہلے گڑے مردے اکھیڑے جاتے ہیں۔ مردوں میں یہ مرض کم ہے۔ مگر عورتیں جن باتوں کی صفائی بھی کر چکتیں ہیں دوبارہ لڑائی کے موقعہ پر پہلی باتوں کو پھر دُہراتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت کا معاملہ اگر فی نفسہٖ[2] خفیف[3] بھی ہو تو پہلی باتوں کی یاد دہانی سے سنگین بن جاتا ہے۔ خصوصًا جبکہ یاد دہانی بھی دل خراش الفاظ سے ہو، جس میں عورتوں کو خاص ملکہ ہے۔ یہ طعن کے موقعہ پر اپنے احسان کو بھی ایسے عنوان سے جتلاتی ہیں، جس سے دُوسرے کا کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارے قصبہ میں ایک خاندان میں نکاح کی تقریب تھی اور صاحب تقریب کی بھاوج بہت مفلس تھی۔ مگر اس نے قرض اور ادھار کر کے اس موقعہ کے لیے جوڑے تیار کیے اور صرف دلہن ہی کا جوڑا نہیں، بلکہ سب گھر والوں کے لیے جوڑے تیار کیے۔ گو وُہ بڑھیا تو نہ تھے مگر نام کرنے کو کافی تھے۔ چنانچہ اُس نے اُمید سے زیادہ کام کر کے دکھلا دیا پھر کسی موقعہ پر بھاوج اور نند میں تکرار ہُوا۔ تو بھاوج کیا کہتی ہے کہ "ارے میں تو وُہ ہوں کہ میں نے نہ ہوتے میں بھی تمہارے وقت میں سارے خاندان پر کفن ڈالا تھا۔" دیکھئے! اس نے جوڑے دینے کو کس لفظ سے ادا کیا کہ ساری ڈکشنری بھی ایسا لفظ نہ نکال سکتی۔ مگر ان کی لڑائی باتوں ہی باتوں میں ہوتی ہے اس سے آگے یہ کچھ نہیں کر سکتیں۔

---

[1] :- طویل۔ [2] :- اپنی ذات میں۔ [3] :- ہلکا۔

عورتوں پر بے جا اعتماد

البتہ ایک طرح ان کا فساد شدید بھی ہو جاتا ہے، کہ بعض دفعہ یہ اپنے آپس کے تکرار کو مردوں سے بیان کر دیتی ہیں، کہ فلانی نے مجھے یوں کہا۔ اور تمہیں یہ کہا، مردوں میں حرارت ہوتی ہے ان پر زیادہ اثر ہوتا ہے، پھر یہ بات ہی تک نہیں رہتے بلکہ ہاتھ سے بھی بدلہ لیتے ہیں، جس سے خون تک ہو جاتے ہیں، اسی لیے مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں کی باتوں پر اعتماد نہ کیا کریں، اور عورتوں کو بھی لازم ہے کہ ایسی باتیں مردوں سے نہ کیا کریں۔

اس کی ایک تدبیر عمدہ یہ ہے کہ چند خاندان ایک گھر میں اکٹھے نہ رہا کریں، کیونکہ چند عورتوں کا ایک مکان میں رہنا ہی زیادہ فساد کا سبب ہے۔ میرٹھ میں ایک باپ بیٹے ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ بیٹے کو مجھ سے تعلق تھا، ان کا ایک خط میرے پاس آیا جس کا خلاصہ دو مضمون تھے۔ ایک یہ کہ میں بعضے خلافِ شرع باتوں پر والد صاحب وغیرہ کو نصیحت کرتا ہوں وہ نہیں مانتے اور خلافِ شرع کام کرتے ہیں۔ دوسرا مضمون یہ تھا کہ والد صاحب اور میں دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، اس لیے بعض شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں نے سارے خط کے جواب میں ایک شعر لکھ دیا ہے

کار خود کن کار بیگانہ مکن [1]

یہ تو پہلی بات کا جواب تھا کہ جب وہ نہیں مانتے تو تم اپنے کام میں لگو، آئندہ ان سے تعرض نہ کرو اور ہے

— برزمین دیگراں خانہ مکن [2]

یہ دوسری بات کا جواب تھا کہ مکان بدل دو اور الگ مکان لے کر رہو، چنانچہ

---

[1]: اپنے کام میں لگو دوسرے کے کام میں مت لگو۔
[2]: دوسرے کی زمین پر رہائش اختیار نہ کرو۔

انہوں نے اس پر عمل کیا، پھر جو خط آیا تو اس میں لکھا تھا کہ مکان بدلنے کے بعد ہی سے تمام پریشانیاں رفع ہوگئیں، اور اب ہمارے تعلقات شگفتہ ہو گئے ہیں۔

صاحبو! میرا تجربہ یہ ہے کہ آجکل الگ الگ رہنا زیادہ موجب امن ہے، نیز آج کل امر بالمعروف اس طرح کرنا کہ کسی کے پیچھے ہی پڑ جائے مفید نہیں، اسلئے میں نے ان کو لکھا کہ جب امر بالمعروف کا اثر نہیں ہوتا تو تم اپنے والد صاحب سے کچھ تعرض نہ کرو، اب تم پر امر بالمعروف واجب نہیں۔ یہ فتویٰ تھا۔ اور دوسرا جملہ مشورہ کے طور پر تھا کہ تم الگ مکان لے کر رہو، کیونکہ آج کل ساتھ مل کر رہنے کا زمانہ نہیں بس اب تو زیادہ وقت تنہائی میں گذارنا چاہیئے۔ اسی میں راحت ہے۔ جیسا کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

جہدے کن در با مردم دانا بنشیں[1]
باصدق و صفا (مراد شیخ عارف)
یا با صنم لطیف و رعنا بنشیں
باشرم حیا (مراد زوجہ عفیفہ) زیں ہر دو اگر یکے میسر نہ شود ؛ از طالع خویش ؛
اوقات مکن ضائع و تنہا بنشیں ؛ در یاد خدا[2]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل ہی وحشی بن جاؤ، بلکہ مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت نہ ملو، کہ اس وقت زیادہ ملنا تمام مفاسد کی جڑ ہے۔

انجمن سازی کا مرض

حتیٰ کہ آجکل جو انجمنیں قائم ہوتی ہیں، اور ناکام رہتی ہیں، ان کا زیادہ تر سبب یہی

---

[1] :۔ کوشش کرو اور کسی عقلمند کے پاس بیٹھو سچائی اور صفائی قلب کے ساتھ یا (اگر شیخ میسر نہ ہو تو) اپنی باحیا عفیفہ بیوی کے ساتھ بیٹھو۔

[2] :۔ کسی کو اگر قسمت سے ان دونوں میں سے کوئی بھی میسر نہ ہو تو اپنے اوقات ضائع نہ کرے بلکہ اکیلا یاد خدا میں بیٹھے۔

ہے کہ یہ زمانہ مل کر کام کرنے کا نہیں ہے۔ کیونکہ آجکل ہر کوئی دُوسروں سے اپنی رائے کا اتباع چاہتا ہے اور جہاں بظاہر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار ہے، جس سے شُبہ ہو سکتا ہے کہ یہ نفع اختلاط کا ایسا ہے جو خلوت و وحدت میں نہیں، وُہ کثرت بھی حقیقت میں وحدت ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں ایک ہی شخص اپنے اثر سے اپنی تائید کے لیے، پہلے سے ایسے لوگوں کو سبق پڑھا پڑھا کر لاتا ہے جن کو اس معاملہ کی سمجھ تو کیا ہوتی، لفظ بولنا بھی نہیں آتا۔ پس کثرت برائے نام ہی ہوتی ہے۔ پھر اس کثرت کا مدار بھی کسی لیاقت پر نہیں ہوتا، محض تموّل پر ہوتا ہے، یعنی اپنے مقاصد و آراء کی تائید بھی ایسے لوگوں سے کرائی جاتی ہے جو زیادہ مالدار ہوں، حالانکہ اس کے لیے اصل ضرورت فہم کی ہے۔

اسی طرح آجکل صدارت بھی مالداروں کو دی جاتی ہے چاہے وُہ یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ صدر کس کو کہتے ہیں۔ کانپور میں ایک جلسہ تھا ایک صاحب کو اس میں اپنی رائے کو قوّت دینا تھی، تو وُہ اپنی تائید کے لیے ایک سیٹھ کو ساتھ لائے اور ان کو راستہ میں خوب پڑھا دیا کہ جب میں تقریر کر چکوں، تو تم کھڑے ہو کر اتنا کہہ دینا کہ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ وُہ بے چارہ بالکل جاہل تھا اتنا لفظ بھی اسے نہ آتا تھا، اسکو رٹتا اور یاد کرتا رہا تاکہ ذہن سے نہ نکل جائے، اور دل میں دُعا کرتا ہو گا کہ تقریر جلدی ختم ہو تو میں اس لفظ کو ادا کر کے چین سے بیٹھوں، چنانچہ خدا خُدا کر کے تقریر ختم ہوئی تو سیٹھ صاحب کھڑے ہو کر فرماتے ہیں کہ میں بھی اس کی تردید کرتا ہوں۔ غریب کو بجائے تائید کے تردید یاد رہ گیا، اس پر مقرّر نے چپکے سے کہا کہ نہیں تائید! تو آپ نے کہا میں اس کی تائیر کرتا ہوں، یہ بالکل ہی مہمل لفظ تھا۔ مقرّر نے پھر لقمہ دیا کہ تائید کہو تائید تو آپ نے تیسری دفعہ تاکید کہا۔ خیر! اس کو لوگوں نے غنیمت سمجھا کیونکہ یہ تائید کے قریب ہی تھا۔ تو صاحبو! اوّل تو کثرتِ رائے میں احمقوں کو جمع کیا جاتا ہے، ان کی کثرت تو حماقت ہی کی طرف ہو گی، پھر ان سے بھی پہلے اپنی رائے منوا لی

جاتی ہے اور سبق کی طرح پڑھا دیا جاتا ہے، کہ ہم یوں کہیں گے تم یوں کہہ دینا جیسے وکیل گواہوں کو پڑھایا کرتے ہیں۔ اب وہ کثرت کیا خاک ہوئی وہ تو ایک ہی شخص کی رائے ہوئی، جس کے اب لوگ مقلد ہوتے ہیں، باقی شریعت میں تو کثرت رائے کوئی چیز نہیں۔ وقت میں گنجائش نہیں ورنہ اس کو بھی بیان کر دیتا۔ تو آجکل ہر شخص اپنی رائے کا اتباع دوسروں سے کرانا چاہتا ہے۔ اسی لیے انجمنوں کا کام نہیں چلتا۔ کیونکہ اراکین انجمن جو اوروں سے اپنا اتباع کرانا چاہتے ہیں، اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے اخلاق کی اصلاح تک نہیں ہوئی۔ ان میں کوئی کسی سے چھوٹا بن کر رہنا گوارہ نہیں کرتا۔ اس لیے بہت جلد ان میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ پھر ہر اک اپنی رائے پر ضد کرتا ہے تو چار دن ہی میں انجمن کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو کام تنہا ہو سکے وہ مجمع کے ساتھ مل کر ہرگز نہ کرو۔ اکثر دیکھا ہے کہ مجمع میں کام بگڑ جاتا ہے۔ دنیوی کامیابی بھی اکثر نہیں ہوتی، اور اگر کبھی دنیا مل بھی گئی تو دین کا تو ستیاناس ہی ہو جاتا ہے۔ اور جو کام تنہا نہ ہو سکے مجمع ہی کے ساتھ ہو سکے، اس کے لیے اگر دینداروں کا مجمع میسر ہو جائے تو کرو۔ بشرطیکہ سب دیندار ہوں یا دینداروں کا غلبہ ہو، اور اگر غلبہ دنیا داروں کا ہو اور دیندار مغلوب یا تابع ہوں، تو ایسے مجمع کے ساتھ مل کر کام کرنا واجب نہیں۔ اس وقت آپ اس کام کے مکلف ہی نہ رہیں گے۔ کیونکہ یہ مجمع بظاہر مجمع ہے اور حقیقت میں یہاں تشتت ہے وہی حال ہوگا، تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى[1] تو یوں کہنا چاہیئے کہ مجمع میسر ہی نہیں پھر جو کام اس پر موقوف تھا وہ واجب یا فرض کیونکر ہوگا۔

اتّفاق کی جڑ

میں سچ کہتا ہوں کہ آجکل جو تقریروں میں کہا جاتا ہے کہ اتفاق کرو، اتفاق کرو۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سب

---

[1] :۔ (اے مخاطب) تو انکو (ظاہر میں) متفق خیال کرتا ہے حالانکہ انکے قلوب غیر متفق ہیں (بیان القرآن) الحشر آیت ۱۴۔

میرے ساتھ اتفاق کریں۔ ہر شخص اپنی رائے پر اتفاق کی دعوت دیتا ہے، اور اس صورت میں قیامت تک اتفاق قائم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قیام اتفاق کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اس کے لیے آمادہ ہو، کہ اگر کوئی میرا اتباع[1] نہ کریگا تو میں اس کا اتباع کر لوں گا۔ بشرطیکہ خلاف شرع کام نہ کرے۔ حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ آجکل لوگ اتفاق پر تو بہت زور دیتے ہیں، مگر اس کی جڑ کو نہیں دیکھتے اتفاق کی جڑ تواضع ہے۔ یہ ایک حجرہ نشیں صوفی کی تحقیق ہے، جس کے سامنے تمام تحقیقات فلسفیہ گرد ہیں۔

آپ نے ایک صوفی کی تحقیق تو سن لی، ذرا اس پر عمل کر کے اتفاق کیجیے، دیکھیے کامیابی ہوتی ہے یا نہیں۔ عمل کرنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ حقیقی فلسفی یہی لوگ ہیں، یہ حضرات معانی کے ان خواص کو سمجھتے ہیں، جن کی حکماء کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اس کا تجربہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کسی فلسفی کو کسی محقق صوفی کے پاس چھ مہینے کے لیے چھوڑ دیجیے انشاء اللہ وہ خود اپنے کو احمق کہہ کر اٹھے گا۔

افلاطون کو کسی نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس سے اول مشاہیر[2] حکماء کے متعلق پوچھا، سب کو لاشئے[3] بتلایا۔ پھر صوفیۂ اسلام جنید اور شبلی وغیرہم کے متعلق پوچھا، اس نے کہا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَلَاسِفَةُ حَقًّا کہ سچے فلسفی یہی لوگ ہیں۔

طلباء اتفاق کے لیے طریق

بس جو لوگ اتفاق کے طالب ہیں اور مل کر کام کرنا چاہتے ہیں ان کو پہلے

---

[1] :- پیروی۔

[2] :- مشہور دانشمندوں۔

[3] :- کچھ نہیں۔

اپنے اندر تواضع پیدا کرنا چاہیئے اور تواضع کیسے پیدا ہوگی؟ اس کے جواب میں تحقیق و دلائل کا تو وقت نہیں مگر تقلیداً مان لیجئے کہ اس کا طریقہ یہ ہے ؎

قال را بگذار و مردِ حال شو   پیش مرد کاملے پامال شو [1]

تواضع حاصل کرنے کے لیے کسی کامل کے قدموں میں پامال ہونے کی ضرورت ہے ؎

نفس نتواں کشت الا ظلِ پیر   دامنِ آں نفس کش را سخت گیر [2]

سخت گیر کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام کا اتباع کرو اور اس کی بات بات پر ناک نہ چڑھاؤ، ورنہ وہی حال ہوگا جو اس شخص کا ہوا تھا، جس نے ایک گودنے والے سے کہا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنا دے۔ اس نے ایک جگہ سوئی چبھوئی تو اس نے آہ کی اور پوچھا کیا بناتے ہو، کہا پیٹ بنا رہا ہوں، کہنے لگا اس کو کھانا تھوڑا ہی رہ گیا ہے پیٹ کو رہنے دو، اس نے دوسری جگہ سوئی چبھوئی۔ اس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو۔ کہا دُم! کہنے لگا کہ شیر دُم کٹا بھی تو ہوتا ہے، اس کو دُم کٹا ہی رہنے دو، اس نے تیسری جگہ سوئی چبھوئی، اس نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بناتے ہو؟ کہا کان! کہنے لگا، شیر بوچا بھی تو ہوتا ہے، اس کو بوچا ہی رہنے دو۔ اس نے چوتھی جگہ سوئی لگائی، آپ نے پھر آہ کی اور پوچھا اب کیا بنا رہے ہو؟ کہا سر! کہنے لگا اس کو بھی رہنے دو۔ یہ شیر بے سر ہی سہی۔ گودنے والے نے جھلا کر سوئی پھینک دی، اور کہا ؎

شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید   ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید [3]

---

[1] : باتوں کو چھوڑ دو اور عمل اختیار کرو۔ ایک کامل آدمی کے سامنے اپنے آپکو مٹاؤ۔

[2] : نفس کو قتل نہیں کر سکتا ہے مگر پیر کا سایہ اسی نفس کو قتل کرنے والے (یعنی پیر) کے دامن کو سختی سے پکڑو۔

[3] : بغیر کان اور سر و پیٹ کا شیر بھی کہیں دیکھا ہے ایسا شیر تو اللہ نے بھی نہیں پیدا کیا۔

آگے مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　از چنیں شیرِ ژیاں پس دم مزن[1]

تو اسی طرح جس کو شیخ کی سختی کا تحمل نہ ہو اور بات بات پر ناک چڑھائے اس کو اصلاح نفس کا نام ہی نہ لینا چاہیئے، وہاں تو اس کی ضرورت ہے ؎

گرم گوید سخت گوید خوش بگیر

تجربہ یہ ہے جس طرح اولاد بدوں نکاح کے نہیں ہوتی، اسی طرح اصلاح اخلاق بدوں کسی شیخ کے پاس پامال ہونے کے نہیں ہوتی۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامنِ رہبر بگیرو پس برآ[2]

یار باید راہ را تنہا مرو　　بے قلاؤز اندریں صحرا مرو[3]

اور بعض بزرگوں کی بابت جو سنا جاتا ہے کہ وہ بدوں کسی شیخ کے کامل ہو گئے مولانا نے اس کی بھی حقیقت بتلائی ہے فرماتے ہیں ؎

ہر کہ تنہا نادر ایں راہ برید　　ہم بعونِ ہمتِ مرداں رسید[4]

یعنی وہ بھی کسی کامل کی توجہ اور دعا ہی سے واصل ہوئے ہیں، گو ظاہر میں کسی سے بیعت نہ ہوئے ہوں، نہ کسی کی صحبت میں رہے ہوں۔ اس کی صورت

---

[1] :- جب تو سوئی چبھنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو
ایسا نقلی شیر بنوانے کی بھی خواہش نہ کر۔

[2] :- اے دل اگر اس سفر کی خواہش رکھتا ہے
راہبر (شیخ) کا دامن پکڑ لو اور پیچھے چلے آؤ

[3] :- کسی کو معین بناؤ (یعنی شیخ) راستہ تنہا نہ طے کرو۔
اس صحراء میں بغیر کسی راہبر یعنی شیخ کے نہ چلو

[4] :- اگر کسی نے یہ راستہ اکیلے اچانک طے کر بھی لیا۔ تو اس نے بھی کسی صاحب ہمت ہی کی مدد سے کیا ہے۔

یہ ہوتی ہے کہ کسی اہل اللہ نے ایک شخص کو دین کے کام میں لگا ہوا دیکھا، اس سے جی خوش ہوا، انہوں نے دعا اور توجّہ کر دی، جس کی برکت سے وہ واصل ہو گیا، مگر اس کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ اگر محبتِ اولیاء اللہ نہ ہو تو کم از کم ان پر انکار بھی نہ ہو، ورنہ توجّہ کیسے ہو گی۔ پس یہ ہے تاریخ اتفاق کے حدوث[1] و بقاء کی کہ اتفاق کا مدار تواضع پر ہے، اور تواضع موقوف ہے اصلاحِ نفس پر، اور اصلاحِ نفس موقوف ہے شیخ کامل کی صحبت پر۔ یا کم از کم عدمِ انکار ہی ہو کر ان کی غیبت و شکایت تو نہ کیا کریں۔

اتفاق میں احتیاط

نیز اتفاق میں علاوہ ان شرائط کے اس کی بھی ضرورت ہے کہ اتنا اختلاط بھی نہ ہو کہ اپنے خاص اسرار[2] دوسروں سے ظاہر کر دے، کیونکہ ممکن ہے کسی وقت یہ تعلق نہ رہے تو پھر ان اسرار کے اظہار پر پچھتانا پڑے گا۔ حدیث میں آتا ہے۔ اَحْبِبْ حبیبك هونًا ما عسٰی ان یکون بغیضك یومًا۔ وابغض بغیضك هونًا ما عسٰی ان یکون حبیبك یومًا۔ یعنی دوست سے سنبھل کر دوستی کرو، زیادہ گھل میل نہ کرو، شاید کسی دن دشمنی ہو جائے تو گھر کے بھیدی کی دشمنی بہت ضرر دیتی ہے۔ اور اگر کسی کو اپنے دوست کی نسبت عداوت کا احتمال نہ ہو تو وہ اپنی ہی نسبت یہ احتمال رکھے کہ شاید کسی دن میں ہی بدل جاؤں۔ اسلیئے اتفاق میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اگر کسی سے عداوت کرو تو وہاں بھی حد کے اندر عداوت کرنا چاہیئے، حد سے نہ بڑھے کیونکہ کیا خبر ہے کسی وقت پر دوستی کرنے کی ضرورت ہو، تو اس وقت آنکھیں سامنے کرنے سے حیا دامن گیر ہو گی اور جبکی دوستی اور دشمنی اعتدال سے ہو گی اس کو کسی وقت بھی پریشانی نہ ہو گی۔

اتفاق و خوشامد کا فرق

یہ تو اتفاق کے حدود و اسباب تھے۔ اور میں بتلا چکا ہوں کہ ایک درجہ نااتفاقی کا بھی

---

[1] :۔ پیدا ہونے اور باقی رہنے۔ [2] :۔ بھید

مطلوب ہے۔ وہ یہ کہ کسی جماعت نے معصیت[1] پر اتفاق کیا ہو، ان کی مخالفت اور ان سے علیحدگی شرعاً مطلوب ہے۔ یا اتفاق تو معصیت پر نہ ہوا تھا، لیکن اتفاق کے بعد وہ لوگ معاصی[2] اختیار کرنے لگے، تو اس وقت دینداروں کو ان سے الگ ہو جانا چاہیئے۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل جہاں دیندار اور بے دین لوگ کسی کام میں اتفاق کرتے ہیں، وہاں بے دین تو اپنے طریقہ پر پختہ ہوتے ہیں اور نہ معلوم دیندار کیوں ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔ بے دین تو وہی کرتے ہیں جو ان کے مذاق کے موافق ہو، اور ان کے مذہب کے موافق ہو، اور ان کی رائے میں مفید ہو، اور دیندار باوجود یہ جان لینے کے کہ یہ کام ہمارے مذہب میں ناجائز یا حرام ہے یا یہ طریقہ ہمارے نزدیک مضر ہے مفید نہیں، یا یہ کام ہماری جماعت کے مذاق کے خلاف ہے، پھر بھی بے دینوں کے ہاں میں ہاں ملائے جاتے ہیں تاکہ اتفاق میں فتور نہ آئے۔

سبحان اللہ صاحبو! اتفاق تو طرفین سے ہوا کرتا ہے، جب دوسری جماعت آپ کے جذبات کی رعایت نہیں کرتی، تو اب وہ اتفاق ہی کہاں رہا۔ بس یوں کہو کہ تم ان کی محض خوشامد کر رہے ہو۔ اگر اتفاق ہوتا تو دوسرے بھی تو تمہاری کچھ رعایت کرتے۔ مگر لوگوں نے آجکل خوشامد کا نام اتفاق رکھ لیا ہے، اس لیے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ مخلوق طعن کرے گی، کہ انہوں نے اتفاق میں کھنڈت ڈال دی۔

میں کہتا ہوں کہ تم اس طعن سے کیوں ڈرتے ہو، صاف کہہ دو کہ ہاں ہم نے اتفاق کو توڑ دیا۔ اس لیے کہ اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب نہیں، بلکہ بعض دفعہ نااتفاقی بھی مطلوب ہے، جب کہ اتفاق سے دین کو ضرر پہنچ رہا ہو۔

بس اب میں ختم کرتا ہوں کیونکہ بقدر ضرورت میں نے اختلاف کے

---

[1]: گناہ۔ [2]: بہت سے گناہ۔

مفاسد اور اتفاق و نااتفاقی کے حدود بیان کر دیئے ہیں۔ اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں اور عمل کی توفیق دیں، آمین۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وعظ کا نام الانسداد للفساد رکھ دیا جائے۔

وَصَلَّی اللّٰہ علیٰ سیدنا و مولٰینا محمّد و علیٰ اٰلِہٖ و اصحابہٖ اجمعین و اٰخرِ دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین۔

اشرف علی ۱۰ شوال المکرم ۱۳۵۰ھ